ISSN 0974-7346

مارچ ۲۰۲۵ء

جلد۲۱۲ــــــعدد ۳

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ
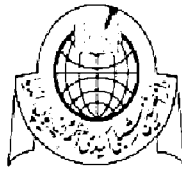
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰؍روپے۔ فی شمارہ ۴۰؍روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام:Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر:0504010100046001

آئی ایف ایس سی:PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کو CSR کی منظوری مل گئی ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ رمضان ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۲۵ء | عدد ۳

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

چند دنوں کے بعد رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے، تقویٰ، خیر اور یسر کی خوبیوں سے اس ماہ مبارک کے "ایام معدودات" کی برکتوں کی تعیین کی گئی۔ یہ بجائے خود امتیازی شان کا اعلان ہے کہ کسی اور مہینے کو یہ ربانی اعزاز نہیں حاصل ہوا لیکن خیر وبرکات کے اس مہینے کی سب سے بڑی شناخت لوح محفوظ میں مکنون، کتاب الٰہی کا نزول ہے۔ قرآن مجید کا تعارف یوں تو مختلف صفات سے ہوا لیکن رمضان المبارک کی نسبت سے خاص طور پر اس کو لوگوں کے لیے ہدایت اور اس ہدایت کو کھلے اور حق وباطل کے امتیاز کے دلائل سے واضح کیا گیا کہ قرآن مجید کی ہر دلیل سے حق وباطل کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید جیسی عظیم ترین نعمت نے اس مہینے کے روز وشب کو وہ درجہ دیا کہ اس کی ایک شب کو ہزار مہینوں سے برتر و بہتر ہونے کا درجہ حاصل ہو گیا۔ نیکیوں اور نعمتوں کی کثرت اور اجر وعطایائے ربانی کی فراوانی ہی تھی کہ امت نے اس مہینے کو قرآن مجید کی سالانہ یادگار اور نیکیوں کے موسم بہار کی شکل میں دیکھا اور اس کے لیے اپنے جذبۂ شکر کو عنداللہ قبولیت کی تمناؤں میں شامل کر دیا۔

***

معارف کے لیے اس ماہ مبارک کی نعمتوں پر ادائے شکر کا ایک اور سبب بھی ہے ۱۳۳۴ ہجری یعنی آج ۱۴۴۶ ہجری سے ایک سو بارہ سال پہلے رمضان المبارک کا مہینہ تھا کہ دارالمصنفین کے آسمان علم وحکمت کے افق پر معارف، ہلال کی صورت نمودار ہوا اور شہوری مطابقت یا موافقت کے اس احساس کے ساتھ اس نے اپنے وجود کا اعلان کیا کہ رسالہ کا پہلا نمبر رمضان المبارک کے مقدس مہینے سے شروع ہوتا ہے کہ ہمارے علوم ومعارف کی سب سے پہلی کتاب اسی ماہ مقدس میں نازل ہوئی تھی ۔ شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن، اب اس تشابہ پر لعلم تشکرون کے تحت جتنا بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہی ہے کہ قرآن مجید کی برکتوں کے طفیل یہ ماہ مبارک، معارف کی بھی سالانہ یادگار بن گیا۔ فالحمد للہ۔

***

معارف اور دارالمصنفین کو قریب سے دیکھنے پر یہ احساس اور قوی ہو جاتا ہے کہ معارف نے حال اور مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے ماضی یا عمر رفتہ کو آواز دینے کے عمل سے گریز نہیں کیا۔ ۱۳۳۴ھ میں اس وقت کی ضرورت نے معارف والوں کو آواز دی تھی کہ علمی رسائل جو تھے اب وہ نہیں رہے۔ ہر طرف سناٹا ہے، ظلمت کدہ میں کوئی امید کا چراغ نہیں، اور حال کا یہ عالم ہے کہ علمی چیزوں کی طرف سے سرد مہری پھیلتی جاتی ہے، سوال فطری تھا کہ اس شکوے کی تسکین کا سامان، حال کے دامن میں کس طرح تلاش کیا جائے کہ کسی گوشے سے کوئی لمعۂ برق کوند جائے تو اطمینان

وتسلی کی آنکھیں روشن ہو جائیں، معارف اسی سوال کے جواب میں علامہ شبلی کی شرح آرزو بن کر ایک فریضے کی تکمیل کے طور پر سامنے آیا، ورنہ بساط شبلی کے حاشیہ نشینوں کو خوب معلوم تھا کہ ایک خالص علمی رسالے کی اعانت کے لیے ملک کہاں تک تیار ہے۔

***

ایک سو بارہ سال گذرنے کے بعد ملک و قوم کے خصائل و مسائل میں ظاہری طور پر فرق کی نوعیتوں کو شمار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ محض ظاہری طور پر ورنہ حقیقت آج بھی وہی ہے جسے اس وقت غیر معتدلانہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ عقل پرستوں اور مذہب و علوم مذہبی کے حامیوں کی تقسیم اس وقت بھی موجود تھی اور زمانہ کے تغیر سے وضع و خو کے بدل جانے کا غم تھا اور زندگی کے مسلمہ اقدار و نظریات کا انقلاب سامنے تھا کہ پرانی دکانوں پر اکسیر بھی بیچی جائے تو خریدار کہاں سے آئے۔ ضرورت تو نئے ساز و سامان سے مزین بازاروں کی ہے۔ علامہ شبلی نے اسی قیامت کا اندازہ کر کے اس فکر کا صور پھونکا تھا کہ اب فیصلے کا وقت ہے کہ کیا چیزیں کس حد تک قبول کے قابل ہیں۔ اسی فکر اور اسی تخیل کا نتیجہ معارف کے وجود کی بنیاد بن گیا کہ اس کے ذریعہ علوم اسلامی کی تاریخ نئے عنوانوں سے اور ماضی کے اکابر کے سوانح نئی روشنائیوں سے پیش کیے جائیں۔ معارف نے اقرار کیا کہ غزالی، رازی، بیرونی، ابن الہیثم، ابن خلدون وغیرہ کے نقوش سے گرچہ حال کا دامن خالی اور تہی ہے تاہم کام پڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ شبلی کے تخیل کی جان یہی خیال تھا جس نے دارالمصنّفین اور معارف کی عملی شکل میں ظہور کیا۔ معارف کے مقاصد اور بھی تھے لیکن اول آخر علوم قرآنی کی اشاعت ہی اس کا مقصود حقیقی یہ قرار پایا کہ قرآن مجید کے تعلق سے عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی مباحث پر محققانہ مضامین کی مسلسل اشاعت ہوتی رہے۔ رمضان کے تعلق سے قرآن مجید کے پیغام کی ترسیل و اشاعت کا یہی جذبہ تھا جس نے اس قرآنی سالانہ یادگار کی برکت و سعادت میں معارف کو بھی شامل کر دیا۔

***

فروری کے معارف میں قرآن مجید کے تعلق سے مدیر معارف ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے انگریزی ترجمہ "دی گلوریس قرآن" کا ذکر آیا تھا کہ مارماڈیوک پکتھال اور عبداللہ یوسف علی کے ترجموں اور ان کی جزوی خوبیوں کے باوجود اطمینان کے قابل ترجمۂ قرآن کی ضرورت کا احساس معارف کو شروع سے رہا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی انگریزی تفسیر اسی خواہش کا مظہر بنی اور اب ڈاکٹر خان کی یہ کاوش بھی اسی ضرورت کے پس منظر میں ایک خواب کی خوبصورت تعبیر سمجھی جانی چاہیے۔ ان خیالات میں بعض مقامات وضاحت طلب تھے، ڈاکٹر خان نے اسی کے پیش نظر چند باتوں کی طرف قارئین کی توجہ دلائی ان کی یہ وضاحت یہاں نقل کی جاتی ہے وہ لکھتے ہیں :

آپ نے معارف فروری ۲۰۲۵ء کے شذرات میں عبداللہ یوسف علی کے بارے میں لکھا ہے کہ "تاویلات کی گمراہی سے اس میں کلیۃً احتراز کیا گیا ہے اور معجزات کو عقلی حماقتوں کا بازیچہ گاہ نہیں بنایا ہے"۔ غالباً یہ بات اس وقت معارف میں لکھی گئی ہوگی لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے اس کے بارے میں بار بار لکھا ہے کہ عبداللہ یوسف علی کے حواشی باطنی اور اسماعیلی آراء سے بھرے ہوئے ہیں۔ میرا یہ موضوع نہیں تھا اور نہ ہی میں مختلف ترجموں کا کوئی موازنہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ترجمے میں وہی لکھا ہے جس کو میں نے معتبر مآخذ کے ذریعے خود سمجھا ہے۔ میرے لئے معجزوں کے انکار یا معراج و جنت وغیرہ کی تاویل کا تو سوال ہی نہیں ہے، البتہ اس کے بارے میں ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اللہ پاک اور ان کے رسول نے ہم کو بتادیا ہے۔ آپ کی تحریر پڑھنے کے بعد میں نے سرسری طور پر عبداللہ یوسف علی کے اصل ترجمے کو دیکھا (بعد کی سعودی اور امریکی اشاعتوں سے بہت کچھ حذف و تبدیل کر دیا گیا ہے) تو مجھے تعجب ہوا کہ عبداللہ یوسف علی معراج کو "صوفیانہ تخیل" یا "صوفیانہ کشف" mystic vision کہتے ہیں (ص ۶۹۱، سورہ بنی اسرائیل کا مقدمہ Holy Quran کتاب بھون، دہلی، ۲۰۱۰ء) نیز ان کے انڈکس سے جنت، فردوس اور Paradise غائب ہیں، انھوں نے جنت کا ترجمہ Garden کیا ہے، یعنی باغ جو میرے خیال میں جنت کو کمتر کرتا ہے۔ Garden لکھنے کی کیا ضرورت تھی جب انگریزی میں Paradise جیسا واضح لفظ موجود ہے؟ اس سے آپ خود ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

***

برسوں پہلے ریاض سعودی عرب سے معارف کے ایک مخلص جناب شان الٰہی بن فیض الحسن نے ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی کی آخری کتاب "النص القرآني الخالد عبرالعصور" بطور ہدیہ وسوغات پیش کی تھی۔ کتاب کیا ہے، بجائے خود معجزۂ قرآن کا ایک اعجازی اظہار ہے۔ سورہ اسراء میں رسم خط کے انیس نمونوں کا صوری مطالعہ قاری کو ایک حیرت کدۂ عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کی اصل قدر وقیمت کا اندازہ اس کے فاضلانہ مقدمے ہی سے کیا جا سکتا ہے اس بیش قیمت ہدیہ کے لیے ادارہ تہہ دل سے مشکور ہے۔

***

افسوس مشہور محقق و مؤرخ و مصنف مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے فرزند مولانا قاضی محمد سلمان مبشر مدنی مبارکپوری نے اسی مہینے وفات پائی۔ تکلم، تبسم اور سادگی و اخلاق سے وہ قاضی صاحب کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ دارالمصنفین آتے رہتے، ادھر عرصے سے نہیں آئے، معلوم ہوا کہ صاحب فراش ہیں اور اب خبر آئی کہ وہ دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو توفیق رضا و صبر دے۔ آمین۔

***

مقالات

قرآن کا تصورِ آفاقیت: لغوی و فکری مباحث کے آئینہ میں

پروفیسر سید مسعود احمد

پروجیکٹ ڈائرکٹر، آفاقیت قرآن، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

masoodahmad1952@gmail.com

سیف اللہ اصغر اصلاحی

پروجیکٹ فیلو، آفاقیت قرآن پروجیکٹ، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

ansar.qasmi1975@gmail.com

دین اسلام روزِ اول ہی سے بنی نوع انسان کے ہر شعبۂ حیات کی رہنمائی کا خدائی نظام و ضابطہ بنا کر بھیجا گیا۔ تمام عالمِ انسانیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ انبیاء و رسل کو مبعوث فرما کر اس کی عالم گیریت کو اُجاگر کیا جو مختلف مقامات، زمانوں اور قوموں میں دعوتِ اسلام کا فریضہ انجام دیتے رہے حتّٰی کہ نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے دینِ اسلام کی عالم گیریت میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ آپ ﷺ کی دعوتِ ہدایت اور نبوت و رسالت تا قیامت تمام جن و انس پر قائم رہے گی۔ لہٰذا آپ ﷺ پر نازل ہونے والے کلامِ الٰہی یعنی قرآن مجید کی تعلیمات و احکام ربانی، اس کی دعوت فکر و عمل اور اس کی ہدایات و قوانین کی ہمہ گیریت و ہمہ جہتیت اور جامعیت و کاملیت کو بیسویں صدی کے بعض دانشورانِ اسلام اور علماءِ کرام و مفسرینِ قرآن نے ایک قدرے نئی اور جامع اصطلاح بنام ”آفاقیتِ قرآن“ پیش کرنا شروع کیا۔ مگر یہ انفرادی نوعیت کی غیر منصوبہ بندانہ ادبی تعبیر تھی جب کہ قرآن عظیم کی جامعیت و کاملیت اور عالم گیریت و ہمہ گیریت کے شایانِ شان تعریف و اصطلاح بوجوہ کثیر عصر حاضر کا بھی تقاضا ہے۔

زیر بحث مضمون میں عربی اور اردو زبانوں میں مستعمل کلمۂ آفاقیت کے معانی و مفاہیم کی روشنی میں ”آفاقیت قرآن“ کی اصطلاح وضع کرنے کی جانب ایک ابتدائی کوشش کی گئی ہے۔

عربی لفظ ”آفاق“ میں فارسی قاعدے کے مطابق اسم کیفیت بنانے کے لیے بطور لاحقہ (یت) لگایا گیا ہے۔ آفاق اسم جمع ہے۔ عُسُر اور عُسر کے وزن پر اس کے دو واحد آتے ہیں جیسے اُفُق اور اُفق۔ اس کے لغوی معنی کنارہ کے آتے ہیں۔ جیسا کہ مختار الصحاح میں ہے:

أف ق: (الْآفَاقُ) النَّوَاحِي، الْوَاحِدُ (أُفُقٌ) وَ (أُفْقٌ) مِثْلُ عُسُرٍ وَعُسْرٍ.
وَرَجُلٌ (أَفَقِيٌّ) بِفَتْحِ الْهَمْزَةِ وَالْفَاءِ إِذَا كَانَ مِنْ (آفَاقِ) الْأَرْضِ وَبَعْضُهُمْ يَقُولُ (أُفُقِيٌّ) بِضَمِّهِمَا وَهُوَالْقِيَاسُ[1]۔

مجد الدین فیروزآبادی نے اس کے معنی میں مزید وسعت پیدا کی اور محض کنارہ سے نکال کر آسمان کے کناروں اور چہار جانب سے چلنے والی ہواؤں کو بھی اس کے معنی میں شامل کیا۔ جیسا کہ القاموس المحیط میں مذکور ہے:

الأُفُقُ، بالضم وبضمتينِ: الناحيةُ، ج: آفاقٌ، أو ما ظَهَرَ من نَواحي الفَلَكِ، أو مَهَبُّ الجَنوبِ والشَّمالِ، والدَّبورِ والصَّبا، وما بين الزِّرَّيْنِ المُقَدَّمَيْنِ في رِوَاقِ البيتِ.[2]

اسی طرح ابن منظور اور زبیدی نے بھی اس کے معنی کو وسعت دیتے ہوئے آسمان کے ساتھ ساتھ زمین کے کناروں کو بھی شامل کیا ہے۔ جیسا کہ ان کی لغات میں مذکور ہے:

أفق: الأُفْق والأُفُق مِثْلُ عُسْر وعسُر: مَا ظَهَرَ مِنْ نَوَاحِي الفَلَكِ وأَطراف الأَرض، وَكَذَلِكَ آفَاقُ السَّمَاءِ نَوَاحِيهَا، وَكَذَلِكَ أُفْق الْبَيْتِ مِنْ بُيُوتِ الأَعراب نَوَاحِيهِ مَا دُونَ سَمْكه، وَجَمْعُهُ آفَاقٌ، وَقِيلَ: مَهابُّ الرِّيَاحِ الأَربعة: الجَنُوب والشَّمال والدَّبور والصَّبا. وَقَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ﴾

قَالَ ثَعْلَبٌ: مَعْنَاهُ نُرِي أَهل مَكَّةَ كَيْفَ يُفتح عَلَى أَهل الْآفَاقِ ومَن قرُب مِنْهُمْ أَيضاً. وَرَجُلٌ أُفُقيٌّ وأَفَقيٌّ: مَنْسُوبٌ إِلَى الْآفَاقِ أَو إِلَى الأُفُق، الأَخيرة مِنْ شَاذِّ النَّسَبِ. وَفِي التَّهْذِيبِ: رَجُلٌ أَفَقِيٌّ، بِفَتْحِ الْهَمْزَةِ وَالْفَاءِ، إِذَا كَانَ مِنْ آفَاقِ الأَرض أَي نَوَاحِيهَا، وَبَعْضُهُمْ يَقُولُ أُفُقي، بِضَمِّهِمَا، وَهُوَ القياس۔[3]

الأُفْقُ، بالضَّمِّ، وبضَمَّتَيْنِ كعُسْرٍ وعسر: الناحِيةُ، ج: آفَاق. قَالَ الله تَعالَى: ﴿وهوَ بالأفقِ الأَعْلَى﴾. وَقَالَ عز وجلّ: ﴿سَنرِيهِم آياتِنا فِي الآفاقِ﴾. وَقد جَمعَ رُؤْبة بينَ اللغتَيْنِ: "ويغترِي مِنْ بعْدِ أُفْقٍ أُفُقَا". قَالَ شَيخنَا: وذكَرُوا فِي الأُفْق بالضمّ أَنه استُعمِلَ مفرَداً وجَمْعا، كالفُلْك، كَمَا فِي النِّهَايَة. قلت: وَبِه فُسِّر بَيتُ الْعَبَّاس رضِي اللهُ عنهُ يمدح النبيَّ صلى الله عَلَيْهِ وَسلم: (وأنتَ لما وُلِدتَ أَشرَقَتِ ال ... أَرضُ وضاءَت بنُورِكَ الأُفقُ). أَو الأُفُقُ: مَا ظَهَرَ من نَوَاحِي الفَلك

---

[1] زین الدین ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الحنفی الرازی (المتوفی ۶۶۶ھ) مختار الصحاح، تحقیق: یوسف الشیخ محمد، المکتبۃ العصریۃ، الدار النموذجۃ، بیروت، صیدا، الطبعۃ الخامسۃ ۱۴۲۰ھ / ۱۹۹۹م۔

[2] مجد الدین ابوطاہر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی (المتوفی، ۸۱۷ھ)، القاموس المحیط، مکتبۃ تحقیق التراث فی موسسۃ الرسالۃ، موسسۃ الرسالۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان، الطبعۃ الثامنۃ، ۱۴۲۶ھ / ۲۰۰۵م، ص: ۸۶۴۔

[3] محمد بن مکرم بن علی، ابوالفضل، جمال الدین ابن منظور الانصاری، الرویفعی الافریقی (المتوفی ۷۱۱ھ)، لسان العرب، دار صادر بیروت، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۴۱۴ھ۔

وأَطْراف الأرْضِ. أو الْأُفق : مَهَبُّ الرِّياح الأرْبَعَة: الجنوبِ، والشَّمالِ والدَّبورِ، والصَّبا. والأفق : مَا بَيْن الزِّرِّينِ المقَدَمَين فِي رُواقِ البَيتِ. وأفق البَيت من بُيوتِ الأعْراب: نَواحِيه مَا دُونَ سَمْكِه. وَهُوَ أَفَقِيّ بِفَتْحَتَينِ لمن كانَ من آفاق الأَرضِ– حَكَاهُ أبو نَصر، كَمَا فِي الصّحاح[۴]۔

المعجم الوسیط میں اس کے معنی کنارہ کے ساتھ ساتھ اس گول لائن کے بھی ہیں جہاں آسمان زمین سے ملا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے صیغۂ واحد سے لفظ "افقی" بنا ہے جس کے معنی اس شخص کے ہیں جس کا کوئی گھر نہ ہو، یعنی جو کسی مخصوص جگہ یا مکان میں نہ رہتا ہو بلکہ پوری دنیا اس کی رہائش گاہ ہو۔[۵]

مذکورہ بالا لغات میں اس لفظ کے معنی اور اس کی وسعت کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ اس لفظ میں زمین و آسمان کے چاروں سمت اور اس کے کنارے شامل ہیں۔ اس معنی سے یہ نتیجہ آسانی سے نکل رہا ہے کہ لفظ "آفاقیت" عربی لفظ "آفاق" میں "یت" فارسی قاعدہ کے مطابق بطور لاحقہ لگا کر بنایا گیا ہے۔

اسم کیفیت (مؤنث)

۱-عالمگیر اور ہمہ گیر ہونے کی صورت حال، تمام انسانیت کے لیے یکساں مفید یا مقبول ہونے کی حالت، یہ نظریہ کہ سب انسان برابر ہیں۔

اس کی ضد اندرونی اور نجی ہے۔

ہندو سماج ذات پات کے عارضی سہارے پر بسر کرنے کے باوصف اب تک اسلام کی افادیت، انسانیت، آفاقیت اور مخلوق سے ہمدردی کو نہیں سمجھ سکا۔[۶]

لفظ آفاقی کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

> آفاقی آفاق سے بنا ہے اگر اسے اُفق و اُفق کی جمع سمجھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے: بہت دور کا وہ کنارہ جہاں زمین آسمان سے ملی ہوئی نظر آتی ہے، جمع کی طرف نسبت کر کے آفاقی کہنا صرفی لحاظ سے درست نہیں ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ واحد کی طرف نسبت کر کے اُفقی کہا جائے۔ اور اگر

---

[۴] محمد بن محمد بن عبد الرزاق الحسینی، ابو الفیض، الملقب بمرتضیٰ الزبیدی (م: ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء)، تاج العروس من جواہر القاموس، تحقیق: مجموعۃ من المحققین، دار الہدایۃ، ج: ۲۵، ص: ۱۲۔

[۵] ابراہیم مصطفی، احمد الزیات، حامد عبد القادر و محمد النجار، المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیۃ، بالقاہرۃ، الناشر: دار الدعوۃ، ج: ۱، ص: ۲۱۔

[۶] ۱۹۷۲ء، جہان دانش، ۵۹۴۔

آفاق کو اسم جنس سمجھا جائے تو معنی ہوں گے: دور دراز سے آنے والے ایسے لوگ جو شہر کے باشندے نہ ہوں۔ اسی طرح اس لفظ کا اطلاق اس شخص پر بھی ہو گا جو حج یا عمرہ کے لئے میقات سے باہر (یعنی دور) سے آیا ہو۔[۷]

اردو لغت میں لفظ آفاقی کی تشریح اور معانی یوں بیان کیے گئے ہیں :

اُفق، آفاق، آفاقی

عربی زبان میں 'اُفق کی جمع' آفاق کے ساتھ فارسی قاعدہ کے مطابق بطور لاحقہ نسبت لگانے سے ''آفاقی'' بنا۔ بطور اسم صفت مستعمل ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے ۱۸۶۷ء میں ''نورالہدایہ'' میں مستعمل ملتا ہے۔

صفت نسبتی: واحد

۱- پوری دنیا سے تعلق رکھنے والا، انسانی برادری سے متعلق۔

۲- ''بیرونی، غیر ملکی، مقامی کی ضد۔ یہ امر سب کو شاق تھا کہ ایک آفاقی شخص نے اس سپہ سالار کو قتل کر ڈالا۔''[۸]

۳- فقہ: میقات کے اس پار کا باشندہ۔ حرم سے باہر چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند میقات ہیں جہاں سے آفاقی یعنی باہر سے آنے والے لوگ احرام باندھتے ہیں۔[۹]

آفاقیت کے معنی و مفہوم

''آفاق'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''آسمان کے کنارے''۔ اصطلاح شعر میں داخلی و خارجی خیالات اور جذبات و احساسات اور مضامین کو ایسے اسلوب کے ساتھ باندھنے کو آفاقیت کہتے ہیں جس سے ہر دور، ہر زمانے، ہر ملک اور ہر نسل کے جذبات و احساسات کی تسکین ہو یعنی شعر میں ایسے معنی اور خیال کا اظہار جو بلا تفریق تمام لوگوں کے لیے باعث حظ و انبساط ہونے کے سبب قابل قبول ہوں۔ مثلاً شعر میں ان عشقیہ کیفیات کو باندھنا جو تمام دنیا کے انسانوں سے رہتی دنیا تک وابستہ ہیں۔

---

(۷) http://old.islamic-content.com/dictionary/word/1360

http:// urdulughat.info/words/374DB%8C%D8%AA%D8%A7%D9%82%D8%A2%D9%81%

(۸) ۱۹۰۷ء، لعبت چین، ۱۳۔

(۹) ۱۹۰۶ء، الحقوق الفرائض، ۳: ۲۳۵۔

آفاقیت کی اصطلاح جنس اور نوع سے متعلق ہے یعنی شے کا وہ تصور جو تمام اشیا کی نمائندگی کرتا ہو جیسے جاندار کے تصور میں چرند پرند اور انسان وغیرہ تمام تصورات شامل ہیں۔ آفاقیت انگریزی اصطلاح Universality کا اردو ترجمہ ہے جو بیسویں صدی کے ربع دوم میں اردو تنقید میں رائج ہوئی۔ شعریات میں ''آفاقیت'' شعر کی اس خصوصیت کو کہا جاتا ہے جس کے سبب فرد کے مخصوص اور محدود جذبات واحساسات وخیالات یا مخصوص واقعات زمانی ومکانی حدود سے ارفع ہو کر ماورائی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں اور ہر شخص کے لیے متاثر کن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے شاعری فلسفے سے زیادہ بصیرت افروز، صادق اور فلسفیانہ ہوتی ہے کیوں کہ شاعری آفاقی صداقتوں کو مسرت انگیز اور جیتی جاگتی شکل میں پیش کرتی ہے۔ تاریخ اور شاعری میں یہی فرق ہے کہ تاریخ خاص زمانے، خاص واقعات اور خاص لوگوں تک محدود ہوتی ہے جب کہ شاعری ہر چیز کو عمومی بنا کر پیش کرتی ہے۔ آفاقیت کی ضد قطعیت Particularity ہے۔ آفاقیت اور قطعیت کا تعین اسلوب اور اظہار بیان سے ہوتا ہے۔ آفاقی شاعری میں فرد کے مخصوص جذبات اور خاص واقعات استعارے اور علامت کا کام کرتے ہیں اور معنی کی نئی جہتیں کھولتے ہیں جب کہ غیر آفاقی شاعری میں ان کی نوعیت محدود ہوتی ہے۔[۱۰]

مذکورہ بالا خصوصیات کو چند مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ دورِ جدید کے متعدد نظریات ایسے ہیں جنھوں نے انسانوں کے کسی خاص گروہ کو خطاب کیا۔ مثلاً کچھ نظریات اپنے عملی پروگرام کے ساتھ، اِس مقصد کے حامل بن کر سامنے آئے کہ کسی خاص نسل کو بقیہ اِنسانی نسلوں پر اقتدار اور غلبہ حاصل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اُن کا پیغام محض اُس نسل کے افراد کے لیے تھا جس کا غلبہ وہ چاہتے تھے۔ بقیہ اِنسانوں کے لیے اُن کے پاس کوئی پیغام نہیں تھا۔ نازی ازم، فاشزم اور ہندتوا اس کی مثالیں ہیں۔ اِس طرح کے نظریات کو آفاقی نہیں کہا جاسکتا۔ اِسی طرح کمیونزم کا اصولی خطاب محض محنت کش طبقے سے ہے، اپنی اساس کے لحاظ سے کمیونزم ایک غیر آفاقی نظریہ ہے۔ نیشنلزم بھی غیر آفاقی نظریہ ہے۔ اِس لیے کہ ہر نیشنلزم کی اپیل اُن حدود کے اندر محدود ہوتی ہے جو اُس نیشن کی حدود ہوں۔ اُس سرحد کے باہر رہنے والے اِنسانوں کے لیے اس میں کوئی پیغام نہیں ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ غیر آفاقی نظریات کا رول اِنسانی تاریخ میں انتہائی منفی رہا ہے۔ اِنسانوں کی باہم ایک دوسرے پر زیادتیوں کے لیے یہ نظریات جواز فراہم کرتے رہے ہیں اور اِس طرح

---

(۱۰) http://www.youtube.com/watch?v=0gj3c3180tk

انھوں نے اِنسانی ضمیر کو سُلانے کا کام انجام دیا ہے‘۔[۱۱]

قرآن مجید کے برحق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایسی تعلیم دیتا ہے جو سب انسانوں کے فطری رجحانات کی آئینہ دار اور ساری نوعِ انسانی کے فائدہ کے لیے ہے اور قرآن کی آفاقیت صرف اس بنا پر ہے کہ وہ کل انسانیت کی کتاب ہے۔ قرآن کی تعلیمات انسانیت کی طرح عالم گیر، ہمہ گیر اور دائمی ہیں۔ وہ ہر ملک کے لیے ہیں، ہر قوم کے لیے ہیں اور ہر زمانے کے لیے ہیں کیونکہ قرآن کریم دینِ اسلام کا ترجمان ہے اور دین اسلام کسی ایک ملک قوم یا زمانے کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسلام تمام انسانیت کا دین ہے، آنے والے ہر زمانہ کے لیے ہے اور قرآن کریم ہی اس دین کا قانونِ اساسی ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا تمام انسانیت کے لیے رسول و نبی ہونا ان شرائط سے ثابت ہوتا ہے:

۱- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص قوم یا نسل یا طبقے کی بھلائی کے لیے نہیں، بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا۔

۲- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اصول پیش کیے جو تمام دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہے۔

۳- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہیں تھی بلکہ وہ ہر زمانے اور ہر حال میں یکساں مفید، یکساں صحیح اور یکساں قابلِ پیروی ہے۔

۴- آپ ﷺ نے صرف اصول پیش کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا اور ان کی بنیاد پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی قائم کر کے دکھادی۔

یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم محمد رسول اللہ ﷺ کو پیغمبرِ عالم کہتے ہیں۔ جب مذہب اسلام سب کے لیے ہے اور اس کی کتاب قرآن سب کے لیے ہے اور اس کا رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لیے ہے تو یہ تینوں چیزیں بلا تفریق انسانیت کی مشترکہ میراث ہیں جن پر کسی کا حق دوسروں سے کم یا زیادہ نہیں ہے، جو چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے خلاف کسی کو تعصب رکھنے یا نظر انداز کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اس وقت ہر ملک و قوم کے عقل مند حلقوں کا رجحان اس طرف ہو رہا ہے کہ اپنے اپنے فکری

---

(۱۱) http://images/unicode_files/heading1.html/april2013/zindgienau.com/Issues/2013/hup-11

نیز دیکھیں: محمد رفعت، ”اسلام سیکولرزم اور آفاقیت“ زندگی نو، نئی دہلی، اپریل، ۲۰۱۳ء، ص:۵۔۱۹

نظاموں کو عالم گیر اور انسانیت کا ترجمان بنا کر پیش کر رہے ہیں اور تمام دنیا میں امن و سلامتی قائم کرنے کے لیے متحدہ بین الاقوامی حکومت کی ضرورت پیش کی جا رہی ہے۔ ایسے وقت میں اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اسلام، جو سب کے لیے بلا تفریق، مذہب قرار دیے جانے کا مدعی ہو اور وہ بہترین نظامِ حکومت پیش کر سکتا ہو، پھر بھی اسلام جیسے عالم گیر اور بہترین نظامِ زندگی پیش کرنے والے مذہب سے حقیقت کے متلاشی اور صداقت کے خواست گار، عقل مند اور مفکر انسانوں کا پہلو تہی کرتے رہنا حیرت انگیز ہے اور بے انصافی ہے۔[۱۲]

تصور آفاقیت کی شرح و بسط کو اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ اور صفات الٰہی سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات تمام انسانوں اور تمام مخلوقات کے لیے ہے۔ اس میں رنگ و نسل اور ذات پات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دنیا میں رہنے بسنے والا کوئی بھی انسان یا جاندار ہو اس کی ذات ہر ایک کے لیے یکساں مفید اور سب کی پروردگار ہے۔ اسی طرح اس کی ذات زمان و مکان کی قید سے منزہ ہے۔ وہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ سورہ الفاتحہ کی پہلی آیت میں آئے لفظ "العالمین" ہی نے اللہ تعالیٰ کا ہمہ گیر اور جامع تصور دیا ہے۔ العالمین میں صرف عالمِ انسان اور عالمِ جن یا عالمِ حیوانات ہی نہیں ہیں بلکہ اس طرح کے ہزاروں لاکھوں دوسرے عالم بھی ہیں جن کی طرف بعض مفسرین کرام نے اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن تمام عالموں کا ہر جگہ، ہر وقت، ہر حال اور ہر زمانہ میں رب ہے۔

دوسری مثال کلام الٰہی کی ہے۔ یہ کلام اپنے زمانۂ نزول سے لے کر تا قیامت تمام انسانوں کی رہنمائی و بھلائی کے ساتھ ساتھ جنوں کی ہدایت کا سامان اپنے اندر بلا کسی فرق و امتیاز کے رکھتا ہے۔ انسانوں اور جنوں کا جو گروہ یا جو جماعت اس سے جب چاہے ہدایت طلب کرے وہ اس کی رہنمائی کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ یہ آفاقی تصور اہل دنیا کے تصور آفاقیت سے بہت وسیع ہے؛ بلکہ قرآن مجید تو تمام مخلوقات کی ہدایت ور ہنمائی کی بات کرتا ہے، بس فرق یہ ہے کہ دیگر مخلوقات کی ہدایت کا مفہوم و جامعیت انسانوں کی ہدایت سے کیفیت و کمیت میں مختلف ہے۔

تیسری مثال دینِ اسلام اور اس کی آفاقیت کی ہے۔ اسلام کا اعلیٰ و ارفع دستورِ حیات جامعیت و کاملیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ قرآن کریم کی ہمہ جہتی و ہمہ وقتی اور فطرت سے ہم آہنگ عالمگیر تعلیمات نے اسے مزید وُسعت بخشی ہے۔ ان تینوں مثالوں سے "آفاقیت" اور "آفاقیت قرآن" کے جامع معانی اور ان کے فہم وادراک تک پہنچنا یقیناً آسان ہو جاتا ہے۔

---

[۱۲] http://alsharia.org/2007/may/islam-ki-afaqiyyat-mufti-abu-ahmad-adbullah

ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی کی تفسیر "مواعظ القرآن"

فضل الرحمٰن اصلاحی
معاون رفیق دارالمصنّفین

islahi1980@gmail.com

ڈاکٹر مختار اصلاحی بن محمد امینؒ اعظم گڑھ کے ممتاز علماء میں شامل ہیں۔ ان کی پیدائش[1] سکندر پور نزد قصبہ جین پور اعظم گڑھ میں ہوئی۔ آپ سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ والد ماجد کا نام محمد امین اور والدہ ماجدہ کا نام رابحہ خاتون ہے۔ انھوں نے اپنا تعارف ان الفاظ میں لکھا ہے:

> میرا نام مختار احمد موسوم بہ اصلاحیؔ، والدہ کا نام محترمہ رابحہ خاتون، والد کا نام جناب محمد امین صاحب اور دادا کا نام جناب لعل محمد صاحبؒ، میرا تعلق انسانی برادری سے ہے، میرا سلسلۂ نسب نسلاً بعد نسلٍ حضرت آدم علیہ السلام سے جا ملتا ہے، چنانچہ اسی خاندان آدم کا ایک حقیر فرد ہوں۔[2]

تعلیم و تربیت: مولانا اصلاحی کی تعلیم کا آغاز ان کے گھر پر قاعدہ بغدادی سے ہوا۔ خاندان کی ایک خاتون فاطمہ دادی سے پارہ عمّ پڑھا۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی بشوق ناظرۂ قرآن مکمل کر لیا۔ بعد میں اردو اور ہندی کی ابتدائی کتابیں گاؤں کے منشی اقبال صاحب مرحوم سے پڑھیں۔ ان کے دوسرے استاذ مولانا عبد الرشید تھے جن کی تعلیم و تربیت سے مولانا اصلاحی حد درجہ متأثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق لکھا ہے:

---

[1] مولانا اصلاحی لکھتے ہیں: "... تاریخ پیدائش لکھنے کا رواج ہمارے خاندان میں نہیں تھا، اس لیے صحیح نہیں بتا سکتا کہ سنہ پیدائش کیا ہے؟ اور آگے چند سطروں کے بعد مزید لکھا ہے کہ غالباً ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا، لہٰذا میری پیدائش آزاد ہندوستان میں ہوئی ہے۔ جب کہ ہندوستان کے عوام غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار چکے تھے، آزاد اور صاف ستھری فضا میں سانس لے رہے تھے"۔ (ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی، نشیب و فراز اور سفر نامۂ حرم، جنوری ۲۰۰۶ء ص ۱۹)۔

[2] ماخذ سابق، ص ۱۶۔

......مکتب ثانی کے ہمارے محترم استاذ مولانا عبد الرشید صاحب [۳] کی حوصلہ مندی چند قدم اور بھی آگے بڑھ گئی ہے، ان کی فیس صرف بچوں کی تعلیم تھی......

...... استاذ محترم مولانا عبد الرشید صاحب کی حسنِ تربیت، اندازِ تعلیم اور ان کی اثر انگیزی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ ایک ہی سال کی مختصر مدت میں ایسا ماحول پیدا کر دیا، جہاں خوفِ خدا، خوفِ آخرت، نماز اور روزہ کے سوا کسی دوسری بات کا ذکر ہی نہیں ہوتا تھا۔ [۴]

مولانا اصلاحی نے جب گاؤں کے مکتب کی تعلیم مکمل کر لی، تو اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا رخ کیا جہاں ان کا داخلہ درجہ عربی اول میں ہوا، اور انہوں نے ۱۹۶۵ء میں وہیں سے فراغت حاصل کی۔ مدرسۃ الاصلاح میں ان کے اساتذہ میں مولانا شبلی متکلمؒ، [۵] مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ اور مولانا غالب احسن اصلاحیؒ بطور خاص ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۷۳ء میں بی یو ایم ایس کیا۔

مدرسۃ الاصلاح میں بحیثیت استاذ: مولانا اصلاحی عہد طالب علمی میں ممتاز طلبہ میں تھے، اس لئے ان کو تدریس کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

۷؍ فروری ۱۹۶۵ء کو میرا تقرّر بحیثیت استاذ ادب و تفسیر مدرسۃ الاصلاح میں کر لیا گیا اور میں بہت ہی ذوق و شوق اور محنت کے ساتھ اس خدمت کو انجام دینے لگا۔ عربی ادب، انشاء، تاریخ دول العرب و الاسلام (مصنفہ طلعت حرب) اور ترجمہ قرآن حکیم، چند ماہ تک پڑھاتا رہا اللہ کا شکر ہے کہ تمام طلبہ مجھ سے مطمئن تھے، کسی کو مجھ سے شکایت نہ تھی۔ [۶]

مولانا اصلاحی اور فکر فراہی: مولانا اصلاحی کے نزدیک فکر فراہی کا مطلب صرف دور جاہلیت کے اشعار کا مطالعہ اور قرآن حکیم کے الفاظ کی لغوی تحقیق نہیں ہے، بلکہ قرآن کی روح ہے۔

---

(۳) ان کا تعلق جماعت اسلامی ہند سے تھا۔ جنہوں نے سکندر پور میں ایک نیا مکتب اس زمانے میں قائم کیا تھا۔

(۴) حوالہ سابق ص ۳۴۔

(۵) مولانا اصلاحی نے ان کے متعلق لکھا ہے: خاص شفقتیں اور نوازشیں میرے ساتھ تھیں اور بہت ہی خلوص اور محبت کے ساتھ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مایہ ناز تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ کے اسرار و رموز سمجھاتے اور علامہ ابن رشد کی مشہور فقہی کتاب بدایۃ المجتہد کا درس دیتے (نشیب و فراز، ص ۸۳)۔

(۶) حوالہ سابق ص ۱۲۱۔

اگر کوئی قاری محض قاری ہو اور بذاتِ خود قرآن نظر نہ آئے تو اس نے قرآن حکیم کو نہیں سمجھا ہے...... اگر قرآن حکیم کی آیتوں کا ربط اور ان کے نظم کو تلاش کرنے والے اپنی زندگیوں کو قرآن حکیم کے مطابق نہ بناسکے، تو ان کا نعرۂ فکرِ فراہی ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔[۷]

مولانا اصلاحی کے بارے میں چند اہل نظر کے تاثرات مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ اُن کی ذہانت اور ان کی گونا گوں علمی صلاحیت کے معترف تھے۔ چنانچہ ان کے مجموعۂ کلام 'زمزمۂ اصلاحی'[۸] جلد اول پر ایک تاثر میں یوں رقم طراز ہیں:

> مولانا مختار احمد اصلاحی اک طرفہ تماشا طبیعت کے مالک ہیں، ان کی ذات پر قدرت کی فیاضیوں کی ایسی بارش ہے کہ علم و ادب کے مختلف میدان، ان کی جولان گاہ بن گئے ہیں، چنانچہ کبھی وہ مسند درس پر فروکش ہو کر قرآن وحدیث کے اسرار ورموز کی گرہ کشائی کرتے ہیں اور عربی زبان وادب اور معانی وبیان کے نکتے بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، تحریر وتصنیف کی وادی میں قدم رکھتے ہیں تو حقائق و معارف کا دفتر کھول دیتے ہیں، وعظ و تقریر کے جلسوں کو رونق بخشتے ہیں تو اپنی شعلہ بیانی کا سکّہ دلوں پر بٹھا دیتے ہیں، ان کا طائرِ خیال جب فضائے شعر میں پرواز کرتا ہے تو اس کی خوش نوائی اور زمزمہ سنجی طبیعت میں کیف و مستی پیدا کرتی ہے۔[۹]

مولانا اصلاحی کی چند معروف کتابیں: ان کی اکثر کتابیں زیادہ تر اصلاح وموعظمت سے تعلق رکھتی ہیں۔ چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱. مواعظ القرآن (۱۱ جلدیں)۔
۲. بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس کے تقاضے۔
۳. سیرتِ بے مثال (حصہ اول)۔
۴. شرح قصیدۂ بردہ۔
۵. آئینۂ کلامِ نبوت۔
۶. عمر بن عبد العزیز۔
۷. ہمارے ابوذر غفاریؓ۔

---

[۷] حوالہ سابق ص ۲۱۵۔

[۸] اب ان کا یہ مجموعہ کلام دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

[۹] مولانا ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی، زمزمۂ اصلاحی جلد اول، مجلس دعوت القرآن جین پور اعظم گڈھ ۲۰۰۱ء، ص ۵۔

۸. قرآن وسنت اور آپ کے مقدمات۔
۹. مسلمانوں کے مسائل کا حل۔
۱۰. قرآن حکیم اور مسلم نوجوان۔
۱۱. بیوی بچوں سے خطاب۔
۱۲. تحقیق کی نئی راہ، (تفسیر مفتاح القرآن، از مولانا شبیر احمد میرٹھیؒ) کا رد۔
۱۳. زمزمۂ اصلاحی (اول، دوم)۔
۱۴. اذانِ محبت۔
۱۵. سب سے بڑا حادثہ: علماء کا بگاڑ۔
۱۶. قرآن حکیم میں دنیا کی تصویر۔
۱۷. شادی کی چند خرافات۔
۱۸. دنیا و آخرت کی کامیابی کے قیمتی نسخے۔
۱۹. نشیب و فراز اور سفر نامۂ حرم۔
۲۰. حقیقت رجم کا تفصیلی جائزہ (غیر مطبوعہ)۔
۲۱. روح البیان (مولانا محمد احمد صاحب پر تاپ گڑھیؒ کے وعظ) کا عربی ترجمہ۔
۲۲. نماز کی تصویر نماز کے آئینے میں۔

تفسیر مواعظ القرآن لکھنے کا مقصد اور اس کی وجہ تسمیہ: مولانا اصلاحی نے "مواعظ القرآن" ۹؍ فروری ۱۹۹۹ء میں لکھنی شروع کی تھی۔ اس کو لکھنے کا اصل مقصد ان کے پیش نظر یہ تھا کہ مسلمان قرآن مجید کو مضبوطی سے تھام لیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> تفسیر مواعظ القرآن کا مقصد، محض قرآن حکیم کے نکات واسرار و رموز کی طرف اشارہ کرنا نہیں ہے، اس کے لیے بے شمار تفسیریں و کتابیں موجود ہیں، بلکہ اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں تمسک بالقرآن یعنی قرآن حکیم کو مضبوطی سے تھام لیں۔

اس ضمن میں حضرت عمرؓ اور فارس کے گورنر ہرمزان کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا اس کو مولانا اصلاحی نے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے استفسار پر ہرمزان نے یہ جواب دیا تھا: "پہلے اہل عرب اکیلے اہل فارس سے لڑتے تھے، لیکن اب عرب کا خدا بھی ان کے ساتھ ہے"۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: وہ کیسے؟ کیا تم نے ہمارے خدا کو ہمارے ساتھ ہو کر لڑتے دیکھا ہے؟ ہرمزان نے کہا کہ اس کا مطلب یہ کہ اہل عرب جس قرآن کی پیروی کرتے ہیں، وہ اللہ کی

کتاب ہے، اس لیے اللہ کی نصرت اور تائید ان کے ساتھ ہے۔ کاش ہم مسلمان قرآن حکیم کو مضبوطی سے پکڑ لیتے، تو آج ہمارے تمام مسائل حل ہو جاتے اور دشمن طاقتوں کی ہمت نہیں ہوتی کہ ہم سے پنجہ آزمائی کا خیال بھی ان کے دل میں آئے۔[۱۰]

مولانا اصلاحی کو تفسیر لکھنے کے پیش نظر یہ جذبہ بھی کارفرما ہے، کہ انسانوں کا تعلق قرآن مجید سے اس قدر گہرا ہو جائے کہ اسے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر قرآن لذیذ معلوم ہونے لگے۔ مولانا کے الفاظ ملاحظ ہوں:

> خلاصۂ کلام یہ کہ مواعظ القرآن کے لکھنے کا صرف مقصد یہ ہے کہ قرآن حکیم کو ہم مضبوطی سے پکڑ لیں، اور قرآن حکیم کے مطابق زندگی گذارنے کی کوشش کریں اور اس کی تعلیم کو عام کریں۔ یہی قرآن ہماری زندگی کے تمام مسائل کا حل ہے۔
>
> قرآن حکیم سے ہمارا تعلق اس قدر ہو جائے کہ قرآن حکیم ہمارے لیے لذت بن جائے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآن حکیم سے زیادہ لذیذ اور شیریں دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔[۱۱]

کتاب کا نام 'تفسیر مواعظ القرآن' رکھنے کی وجہ اس کا اندازِ موعظت ہے۔ اس میں پند و نصیحت کا پہلو غالب ہے۔ مولانا اصلاحی سے قبل مولانا شمس پیر زادہؒ نے 'تفسیر دعوت القرآن' اور مولانا وحید الدین خاںؒ نے 'تذکیر القرآن' لکھ کر قرآن کے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

آغازِ تفسیر: اس تفسیر کا آغاز ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> الحمدللہ۔ اللہ کی توفیق سے "مواعظ القرآن" کی یہ پہلی جلد (تفسیر سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی پانچ آیات) پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ راقم نامۂ سیاہ کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے، آخرت میں ہماری نجات کا ذریعہ بنائے، اس کو پڑھ کر اور سن کر قرآن حکیم کی محبت دلوں میں پیدا ہو جائے اور قرآن حکیم کے مطابق زندگی گذارنے کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہو، آمین۔[۱۲]

مولانا نے پیش لفظ میں ٹائمز (۲۸؍ دسمبر ۱۹۸۶ء) کے حوالہ سے ایک اہم رپورٹ نقل کی ہے کہ جاپانیوں نے ۱۹۴۹ء میں ایک صنعتی سمینار کا انعقاد کیا۔ اس سمینار میں امریکہ کے ڈاکٹر ایڈورڈ ڈیمنگ کو بالخصوص مدعو کیا گیا۔ ڈیمنگ نے اپنے لکچر میں اعلیٰ صنعتی پیداوار کا ایک نظریہ پیش کیا،

---

[۱۰] مولانا ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی، مواعظ القرآن، جلد اول، مجلس دعوۃ القرآن، ۲۰۱۸ء، ص ۶۱۔

[۱۱] حوالہ سابق ص ۱۲۔

[۱۲] حوالہ سابق ص ۶۔

جس میں اعلیٰ قسم کی چیزیں بنانے پر زور دیا گیا۔ اس چیز کو انگریزی میں کوالٹی کنٹرول کہتے ہیں۔ جاپانیوں نے امریکی پروفیسر کی نصیحت کو حرزِ جاں بنایا اور عملی طور پر گامزن ہو کر اپنے تمام صنعتی کارخانوں کو کوالٹی کنٹرول کے نظریے پر چلانے لگے۔ انہوں نے یہ طے کر لیا کہ دنیا میں وہ ایسا مال فروخت کریں گے جو بے عیب اور بے نقص ہو۔ اپنی اس پالیسی سے وہ چند سالوں میں دنیا بھر کی مارکٹ میں چھا گئے۔ یہاں تک کہ برطانیہ کے ایک دکان دار نے یہ اعتراف کیا کہ جاپان سے اگر دس لاکھ کی تعداد میں کوئی سامان منگایا جائے، تو مجھ کو یقین ہے کہ ان میں کوئی ایک سامان بھی غیر معیاری نہیں ہوگا۔[۱۳]

مولانا اصلاحیؒ نے مذکورہ واقعہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> اس میں شبہ نہیں کہ اس دنیا میں صرف قرآن حکیم ہی ایک ایسی کتاب ہے، جو بے نقص ہے۔ ذالک الکتاب لاریب فیہ کا دعویٰ اسی کتاب کے بارے میں کیا گیا ہے۔ یہ ایسی بے نقص کتاب ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال سے ہزار کوششوں کے باوجود معمولی کمی کی طرف بھی اشارہ کرنے کی جرأت کسی کو نہ ہو سکی۔[۱۴]

مولانا اصلاحی نے لکھا ہے کہ ان کی تفسیر چند قابل اعتماد تفسیروں کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے یعنی ان کی کوشش تفسیر بالماثور سے تعلق رکھتی ہے۔[۱۵]

انہوں نے سورۃ الکہف (آیت: ۱۰۹) قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربّی لنفد البحرقبل أن تنفد کلمات ربّی ولو جئنا بمثلہ مددا۔ کی تفسیر میں لکھا ہے: ”نزول قرآن کے عہد زریں سے لے کر آج تک قرآن حکیم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں، پھر بھی اس کی گہرائی کا اندازہ ابھی تک لگایا نہیں جاسکا ہے اور نہ کبھی کوئی لگا سکتا ہے“:

حشر تک کھل نہ سکے راز اسے کہتے ہیں
جستجو پھر بھی کرو ناز اسے کہتے ہیں[۱۶]

مولانا اصلاحی اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا بھر میں جو حالات مسلمانوں کے آج ہیں وہ

---

[۱۳] حوالہ سابق ص ۸۔
[۱۴] حوالہ سابق ص ۸۔
[۱۵] حوالہ سابق ص ۱۴۔
[۱۶] حوالہ سابق ص ۱۵۔

قرآن مجید کو عملاً ترک کر دینے کے نتیجے میں ہیں۔ مسلمان اس ذلت و ادبار اور فلاکت سے اگر نکلنا چاہتے ہیں، تو انہیں قرآن مجید کا دامن تھامنا ہو گا۔ مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> آپ نے بڑے بڑے فلسفیوں کے فلسفوں کا مطالعہ تو کیا ہے، ان کی تھیوریاں تو یاد کی ہیں، سائنس اور ریاضی کے پیچیدہ فارمولوں کو یاد کیا، نیوٹن کے بتائے ہوئے قانون کشش کا مطالعہ تو کیا ہے، کیا اسی محنت شاقہ اور سنجیدگی سے قرآن حکیم کا مطالعہ کیا ہے؟
>
> وہ کون سی چیز ہے، جو قرآن حکیم میں نہیں ہے کہ اس کو چھوڑ کر دوسری طرف للچائی ہوئی نگاہیں آپ اٹھا رہے ہیں: "أفلا يتدبرون القرآن أم علىٰ قلوب أقفالها" کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔[۱۷]

مولانا اصلاحی بڑی دل سوزی سے مسلمانوں کو اس لازوال نعمت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے برطانیہ کے وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کی اس تقریر کو یاد دلایا ہے، جو اس نے ہاؤس آف کامنز میں قرآن مجید کو ہاتھ میں لے کر ممبران ہاؤس سے مخاطب ہوئے کہا تھا:

So long as the Egyptians have got this book with them we will never be able to enjoy quiet or peace in that land.

یعنی برطانوی شہنشاہیت کے قدم مصر میں اس وقت تک نہیں جم سکتے، جب تک کہ ان میں یہ کتاب (قرآن) موجود ہے۔ گلیڈ اسٹون نے گہرے مطالعہ اور سوچ سمجھ کر مذکورہ بات کہی ہے۔[۱۸]

مواعظ القرآن جلد اول میں پیش لفظ کے بعد چند ذیلی سرخیاں اس طرح کی قائم کی گئی ہیں: باتیں کچھ اپنے دل کی، فضل خداوندی، قرآن حکیم کی حفاظت، نقطے اور اعراب، سورتوں اور آیتوں کی تقسیم، قرآن سب سے بڑی دولت ہے، دل ہلا دینے والا مقدمہ، قرآن کی طاقت، ایک سبق آموز واقعہ، قرآن حکیم کا پیغام عالم گیر ہے، قرآن حکیم کا حق اس پر عمل کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے شکایت وغیرہ۔

اندازِ ترجمہ و تفسیر: مولانا اصلاحی نے سورۃ الفاتحۃ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> حمد اللہ کے لیے ہے، جو ہر عالم کا پالنے والا ہے، نہایت مہربان ہمہ آن رحم کرنے والا ہے، روز جزا کا مالک ہے، تیری ہی بندگی ہم کرتے ہیں اور تجھی سے ہم مدد چاہتے ہیں، چلا ہم کو سیدھے راستہ پر، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ تیرا غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہیں،

---

[۱۷] حوالہ سابق ص ۲۰۔

[۱۸] حوالہ سابق ص ۲۱۔

آمین۔

مولانا اصلاحی نے اس تفسیر میں کلام عرب سے بھی استفادہ کیا۔ "حمد" کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

حمد کے معنیٰ ثنائے کامل اور شکر کے ہیں، نیز کسی چیز کے حق کی پوری پوری ادائیگی کے بھی آتے ہیں، حماسہ کا ایک شاعر قیس بن الخطیم کہتا ہے:

یھون علیّ أن تردّ جراحھا
عیون الأواسی إذ حمدت بلاءھا

(یہ میرے لیے بہت آسان ہے کہ میرے نیزے کا لگایا ہوا زخم اپنی خباثت اور وسعت کی وجہ سے علاج کرنے والی نرسوں کی آنکھوں کو زخم کی طرف دیکھنے سے لوٹا دیں، جب کہ میں نے زخم لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے)۔

اس شعر میں "حمدت بلاءھا" کا مطلب ہے کہ إذ قضیت حق بلاءھا وأبلغتھا غایتھا یعنی زخم لگانے کا جو حق تھا، اس کو میں نے پورا کر دیا اور اس کی انتہا تک پہنچا دیا۔ الحمد للہ کہنے کا مطلب ہے کہ بندہ اللہ کی تعریف کرنے اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے میں انتہائی حد تک مشغول ہے۔[۱۹]

مولانا اصلاحی نے سورہ فاتحہ کی عصری تقاضوں کے مطابق تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک عنوان "سورہ فاتحہ اور اتحادِ ملت" کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے:

قرآن حکیم اور نماز دونوں کا افتتاح جس طرح سورہ فاتحہ سے ہوتا ہے، اسی طرح اتحاد ملت کا افتتاح بھی سورہ فاتحہ سے ہوتا ہے۔ جو لوگ روزانہ اپنی نمازوں میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہوں، پھر بھی ان کے درمیان اختلاف ہو، اور ہر چھوٹے بڑے مسئلے پر باہم لڑنے جھگڑنے لگتے ہوں تو اس سے زیادہ حیرت کی بات کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ سورہ فاتحہ سے ان کی زندگی عملی طور پر ہٹی ہوئی ہے۔[۲۰]

"إیاک نعبد وإیاک نستعین" کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی نے لکھا ہے:

یہ ہے استغناء کی وہ دولت جو إیاک نعبد وإیاک نستعین کی حلاوت ملنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس کو زبان سے ادا کرنا اور نماز کی رکعتوں میں دہرانا آسان ہے، لیکن اس کی عملی تصویر بن جانا آسان نہیں، کیوں کہ اس کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے، کوئی لمحۂ حیات اس اقرار سے

---

[۱۹] حوالہ سابق ص ۷۷-۷۸۔

[۲۰] حوالہ سابق ص ۷۷۔

خالی نہیں ہوتا، اسی لیے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

چوں گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را[۲۱]

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے یہ نکتہ بھی لکھا ہے:

سورہ فاتحہ پورے قرآن کا راز اور لبِ لباب ہے، اور سورہ فاتحہ کا راز یہی آیت 'اِیّاک نعبد واِیّاک نستعین' ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے: قال بعض السلف: الفاتحۃ سرّ القرآن وسرّھا ھذہ الکلمۃ[۲۲]

مولانا اصلاحی سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں مولانا ابو الکلام آزادؒ کی طرح بڑی دراز نفسی سے کام لیتے ہیں۔ تقریباً ۱۰۷ صفحات میں صرف سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کی ہے۔ اس کے بعد سورۃ البقرہ کی تفسیر میں اس کے فضائل میں ایک مشہور حدیث نقل کی ہے:

من تعلّم القرآن وعلّق مصحفہ ثم لم یتعاھدہ ولم ینظرفیہ جاء یوم القیامۃ متعلقاً بہ یقول یا رب العالمین انّ عبدک ھذا اتّخذنی مھجوراًفاقض بینی وبینہ۔[۲۳]

یعنی جس شخص نے قرآن پڑھا مگر پھر اس کو بند کر کے گھر میں معلق کر دیا، نہ اس کی تلاوت کی پابندی کی، نہ اس کے احکام میں غور کیا تو قیامت کے روز قرآن اس کے گلے میں پڑا ہوا آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرے گا کہ آپ کے بندہ نے چھوڑ دیا تھا، اب آپ میرے اور اس کے درمیان فیصلہ فرمادیں۔[۲۴]

اس سورہ کا نام سورۃ البقرۃ رکھنے کی یہ وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس میں ذبح بقرہ کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ تو وہ ذبح سے بچنے کے لیے بہت سی موشگافیوں میں الجھ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا سارا کچا چٹھا کھول دیا۔

مولانا اصلاحی اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

سورہ بقرہ دنیا اور آخرت کے تمام احکام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، لیکن ان احکام کی پابندی اور صراط مستقیم پر چلنا بغیر ذبح بقرہ کے ناممکن ہے۔

---

(۲۱) حوالہ سابق ص ۱۳۴-۱۳۵۔

(۲۲) حوالہ سابق ص ۱۳۶۔

(۲۳) اخرجہ الثعلبی (فی التفسیر ۱/۳۸۱) ابن حجر العسقلانی، الکافی الشافی (۲۰۵)

(۲۴) مواعظ القرآن، جلد اول، ص ۶۰

بنی اسرائیل کے جو واقعات تفصیل کے ساتھ اس سورے میں بیان کیے گیے ہیں اور ان کی بے اعتدالیوں، سرکشیوں اور نافرمانیوں کی سرگزشت کی طرف جو اشارے کیے گئے ہیں، اگر غور کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ بنی اسرائیل بے چوں چرا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکموں کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہیں تھے...... اطاعت الٰہی سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے اور نفسانی خواہشات کے غلام تھے، جس کا بیّن ثبوت ذبح بقرہ کا واقعہ ہے، جو ان کے چوں چرا، اور اگر مگر کی واضح مثال ہے۔[۲۵]

"ھدی للمتقین" کی تشریح میں مولانا اصلاحی نے قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چھوٹے بڑے گناہوں کو چھوڑ دینے کا نام "تقویٰ" ہے۔ چھوٹے گناہوں کو کبھی بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ بڑے پہاڑ بھی ریت کے چھوٹے چھوٹے گناہوں کا مجموعہ ہوتے ہیں:

خلِّ الذنوب کبیرھا وصغیرھا فھو التُّقیٰ
واصنع کماشٍ فوق أر ض الشوک یحذر مایریٰ
لاتحقرنّ صغیرۃ إن الجبال من الحصیٰ

ایمان بالغیب کے ضمن میں امریکہ کے ایک مشہور مشنری ڈاکٹر بلی گراہم کی کتاب "مسرت کا راز" میں اس نے لکھا ہے کہ اسے دنیا کے ایک بڑے لیڈر نے لکھا کہ تم مجھ سے فوراً ملاقات کرو۔ جب وہ اس لیڈر سے ملنے پہنچے، تو وہ اسے ایک کمرے میں لے گیا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ:

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی نے اپنی معنویت کھودی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان! کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو؟[۲۶]

مولانا اصلاحی نے مذکورہ عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

مذکورہ لیڈر نے جس دنیا کو نامعلوم دنیا کہا ہے، وہی عالم آخرت ہے، جس کو ایمان بالغیب کے نتیجے میں انسان پا جاتا ہے۔ اگر ایمان بالغیب کی نعمت سے مذکورہ لیڈر سرفراز ہوتا تو اس یاس

---

[۲۵] حوالہ سابق ص ۱۷۱۔

[۲۶] حوالہ سابق ص ۱۹۸۔

وحسرت کا وہ شکار نہ ہوتا۔[۲۷]

قرآن پاک نے بتایا کہ رسول اکرمؐ قیامت کے دن اللہ پاک سے شکایت کریں گے کہ ان کی قوم نے قرآن پاک کو درکنار کر دیا تھا (سورۃ الفرقان، آیت:۳۰)۔ مولانا اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس کو "دل ہلا دینے والا مقدمہ" کہا ہے:

> قرآن حکیم کو قولاً اور عملاً نظر انداز کر دینا اس کتاب کو گویا کتابِ مہجور بنا دینا ہے۔ قرآن حکیم کو تو دراصل کفار و مشرکین ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یہ انہیں کی صفت ہے، لیکن قرآن حکیم پر ایمان رکھنے کے باوجود اگر مسلمان اس کتاب مقدس کو عملاً چھوڑ دیں، ان کی زندگیوں میں قرآن حکیم نظر نہ آئے تو یہی کہا جائے گا کہ مسلمانوں نے بھی قرآن حکیم چھوڑ دیا ہے۔[۲۸]

ایک دوسری آیت فإذا لقيتم الذين كفروا فضرب الرقاب حتىٰ إذا أثخنتموهم فشدوا الوثاق فإما بعد وإما فداء حتى تضع الحرب أوزارها [سورۃ محمد، آیت ۴] (پس جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو، یہاں تک کہ خوب قتل کر چکو تو ان کو مضبوطی سے باندھ لو، یا تو احسان کرنا ہے، یا فدیہ کا معاملہ کرنا ہے، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے) کی تفسیر میں مولانا نے بعض عقلی مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی سانڈ جنگل میں کھاتا پیتا اور ٹہلتا ہے تو اس سے تعرض کی ضرورت نہیں، لیکن اگر وہ آبادی میں آکر گزرگاہوں پر کھڑا ہو جائے، اور راستہ روکنے لگے اور وہاں سے گزرنے والوں پر حملے شروع کر دے تو مسافروں کی تحفظ کی خاطر اس سانڈ کو گولی مار دی جاتی ہے۔

امام رازی کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ اسلام کے دشمنوں کے مقابلے میں اسلامی جنگ جاری رہے گی، یہاں تک کہ اہل کفر کی کوئی پارٹی اسلامی جماعت سے جنگ کرنے والی باقی نہ رہ جائے۔[۲۹]

ایک اور آیت وكم أهلكنا قبلهم من قرن هم أشد منهم بطشا فنقبوا في البلاد هل من محيص إن في ذالك لذكرىٰ لمن كان له قلب أو ألقى السمع وهو شهيد [سورۃ ق، آیت ۳۶-۳۷] (اور ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، جو ان سے کہیں زیادہ طاقت ور تھیں، وہ ملکوں میں خوب گھسے۔ کیا انہیں کوئی جائے پناہ ملی؟ یقیناً اس میں یاددہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جس کے

---

(۲۷) حوالہ سابق ص ۱۹۸۔

(۲۸) حوالہ سابق ص ۶۰۔

(۲۹) تفسیر مواعظ القرآن جلد دوم، جولائی ۲۰۱۲ء ص ۱۴۰۔

پاس دل ہو یا توجہ کے ساتھ کان لگا کر سنے) کی تفسیر میں مولانا اصلاحی نے لکھا ہے:

> مکہ والے ہوش میں آجائیں، اور اللہ کی نافرمانی سے باز آجائیں اور گذشتہ قوموں کے حالات سے سبق حاصل کریں۔ ہم ان سے پہلے بہت سی امتوں کو ہلاک کر چکے ہیں، جو شان و شوکت اور مادّی طاقت میں ان سے زیادہ تھے، تمام ملکوں میں گھومتے پھرتے تھے، بڑے بڑے تجارتی سفر کرتے تھے، لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو کہیں ان کو پناہ کی جگہ نہ مل سکی۔[۳۰]

ایسے ہی فلا تهنوا وتدعوآ إلى السلم وأنتم الأعلون والله معكم ولن يتركم أعمالكم (پس (اے مسلمانو! تم کمزور نہ پڑو اور صلح کی دعوت نہ دو اور تم ہی غالب رہو گے، اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال میں حق تلفی نہیں کرے گا-سورۃ محمد، آیت ۳۵) کی بڑی نشین اور عصری تقاضوں کے مطابق مولانا اصلاحی نے تفسیر کی ہے:

> اہل ایمان کے لیے بہت ہی ایمان افروز اور فرحت بخش آیت ہے، اور ایسا سمندر ہے، جس کی لہروں میں باطل طاقتوں کی بڑی بڑی چٹانیں تنکے کی طرح بہہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے فرماتا ہے کہ کسی بھی حال میں دشمنوں کے سامنے دبنے اور کمزوری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سخت سے سخت حالات ہوں، لیکن اپنی طرف سے دشمنوں کے سامنے صلح پیش کش نہ کرو۔ خود سے صلح کی درخواست کرنا بڑی بزدلی کی علامت ہے، جو اللہ پر ایمان لانے والوں کے شایان شان نہیں ہے۔

اس موقع پر 'فنقّبوا في البلاد' کی عمدہ لغوی تاویل وتفسیر مولانا اصلاحی نے یوں کی ہے:

> تنقیب کے معنی سوراخ کرنے کے ہیں۔ یہاں عربی محاورہ میں 'تنقیب في البلاد' سے اشارہ زمین میں چلنے پھرنے، تجارتی اور تفریحی سفر کرنے کے ہیں، جیسا کہ آج سائنس و ٹکنالوجی کے دور میں مختلف تیز رفتار سواریوں کے ذریعہ مختلف تجارتی و تفریحی سفر جاری ہیں...... لیکن جب اللہ کی گرفت آجائے گی تو تیز رفتار راکٹ اور ہوائی جہاز سے بھی پرواز کر کے کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ قرآن میں گزشتہ قوموں کے جو واقعات بیان کیے گیے ہیں، وہ آنکھوں سے غفلت کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہیں۔[۳۱]

حروف مقطعات اور مولانا اصلاحی کا موقف: اس سلسلے میں ان کا موقف جمہور مفسرین

---

[۳۰] حوالہ سابق ص ۲۶۹۔

[۳۱] حوالہ سابق ص ۲۶۹۔

کے ساتھ ہے ۔یعنی حروف مقطعات کی جو بھی حکمت ہو اس کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کے مندرجہ ذیل قول سے استدلال کیا ہے:لکل کتاب سرّ وسرّ القرآن أوائل السور (ہر کتاب کا ایک راز ہوتا ہے اور قرآن کا راز سوروں کی ابتداء میں کرنے والے کلمات ہیں)۔

نقد و تبصرہ:

۱- مجموعی لحاظ سے 'تفسیر مواعظ القرآن' اسم بامسمّیٰ تفسیر ہے۔

۲-مولانا اصلاحی سورۃ الرحمن میں 'فبأيّ آلاء ربكما تكذبان' کا ہر جگہ ترجمہ "پس (اے انسانوں اور جنوں) تم دونوں اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے" سے کیا ہے۔ لیکن ہر جگہ سیاق کلام اس ترجمے کا ساتھ نہیں دیتا۔ مثلاً: خلقَ الإنسانَ من صلصال كالفخّار وخلَق الجانَّ من مار ج مّن نار فبأيّ الآ ءِ ربّكما تكذّبان (سورۃ الرحمن ۱۴-۱۶)۔ اس لیے کہیں نعمتوں، کہیں کرشمہ سازیوں وغیرہ مناسب ترجمہ ہے۔ جیسا کہ مولانا فراہیؒ نے لفظ آلاء کی تحقیق میں لکھا ہے:

"أجمعوا على أن معناه النعم، ولكن القرآن وأشعار العرب يأباه والظاہر أن معناه : الفعال العجيبۃ، فارسيتہ:کرشمہ،ولما كان غالب فعالہ تعالیٰ الرحمۃ ظنوا أن الأ لاء هي النعم"۔[۳۲]

یعنی جمہور مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس کے معنیٰ نعمت کے آتے ہیں، لیکن قرآن مجید اور اشعارِ عرب اس معنی کی نفی کرتے ہیں۔اور اس کا ظاہری معنیٰ عجیب افعال کے ہیں۔اور اس کی فارسی کرشمہ ہے۔چوں کہ اللہ تعالیٰ کے اکثر افعال رحمت پر دلالت کرتے ہیں، اس لئے جمہور نے اسے نعمت کے ہم معنی گمان کیا ہے۔

۳-ڈاکٹر مختار اصلاحی شعر و شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی شاعر ہیں، اور اپنی تفسیر میں جگہ جگہ بر محل اپنے اشعار کے علاوہ اکابر شعراء کے اشعار انہوں نے کثرت سے نقل کیے ہیں۔

۴- جلد اول کے خاتمہ پر ۹؍فروری ۱۹۹۹ء لکھا ہوا ہے، اور آخری جلد پر لکھا ہے کہ ۴؍نومبر ۲۰۰۲ء کو آخری جلد تکمیل کو پہنچی۔ یعنی تین سال کے قلیل عرصہ میں گیارہ جلدیں لکھی گئی ہیں، جو اس طرح سنجیدہ اور بڑے کام کے لیے کم معلوم ہوتا ہے۔

---

[۳۲] الامام عبد الحمید، مفردات القرآن، تحقیق الدکتور اجمل ایوب الاصلاحی، مدرسۃ الاصلاح، الدائرۃ الحمیدیۃ، سرائے میر اعظم گرہ، ۲۰۱۲ء، ص۱۲۵-۱۲۶

تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے عربی سفرناموں میں ہندوستان

ڈاکٹر محمد شاکر رضا
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
shakir.efl@gmail.com

عرب ایک تجارت پیشہ اور جہاز راں قوم تھے، اس لیے ان کو ہمیشہ نئے نئے ملکوں کے حالات جاننے سے دلچسپی تھی۔ ہندوستان سے عربوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ عرب تاجر ہزاروں برس پہلے سے ساحل ہندوستان تک آتے رہے تھے اور یہاں کے سامان تجارت اور پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعہ یوروپ تک پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، چین اور جاپان تک لے جاتے تھے۔ عہد عباسی میں جب مسلمانوں کا علمی دور شروع ہوا تو جغرافیہ سے ان کی دلچسپی نے علمی تحقیق وتفتیش کی شکل اختیار کرلی اور ان میں بڑے بڑے سیاح اور جغرافیہ کے ماہرین پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف ملکوں کی جغرافیہ پر بڑی اہم کتابیں لکھیں۔ ان مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے ہندوستان کے حالات کا عینی مشاہدہ کرکے یا عینی مشاہدین سے سن کر یا ان کی کتابوں میں پڑھ کر ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کے حالات اور ان کے عادات واطوار کے بارے میں لکھا۔ ان عربی سفرناموں میں اس دور کے ہندوستان کے متعلق جس قدر مختلف النوع اور مفید معلومات ملتی ہیں، وہ دوسری کتابوں میں نہیں ملتی ہیں۔ ان کتابوں میں تیسری اور چوتھی صدی ہجری (نویں اور دسویں صدی عیسوی) میں لکھی گئی ابن خرداذبہ کی کتاب المسالک والممالک، سلیمان التاجر اور ابوزید السیرافی کی کتاب سلسلة التواریخ، بزرگ بن شہریار کی کتاب عجائب الهند، ابو الحسن المسعودی کی کتاب مروج الذهب ومعادن الجوهر، المقدسی البشاری کی کتاب أحسن التقاسيم في معرفة الأقاليم نہایت اہم ہیں۔ یہ کتابیں اعلیٰ درجے کی تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کتابوں کی روشنی میں اپنی کتاب "عرب وہند کے تعلقات" لکھی ہے، جس میں بڑی تفصیل سے عرب وہندوستان کے قدیم تعلقات دکھائے ہیں۔ بعد میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اس سلسلہ کو بڑھاتے ہوئے ایک کتاب "ہندوستان عربوں کی نظر میں" کے نام سے لکھ کر دو جلدوں میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے شائع کی، جس میں ہندوستان کے متعلق عرب سیاحوں اور جغرافیہ دانوں

وغیرہ کے بیانات کو جمع و ترتیب دے کر ان کا ترجمہ پیش کیا۔ اس کتاب میں عرب مصنّفین کے بیانات کی تصحیح و تحشیہ اور نقد و تبصرہ کا کام ابھی باقی ہے، جس کی طرف اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا معین الدین احمد ندوی، ناظم شعبۂ علمی، دار المصنفین اعظم گڑھ نے اشارہ کیا ہے[1]۔

المسالک والممالک: عربی زبان میں سب سے پہلی کتاب جس میں ہندوستان کے احوال ملتے ہیں، وہ ابن خرداذبہ کی کتاب "المسالک و الممالک" ہے۔ ابن خرداذبہ ابوالقاسم عبید اللہ بن عبد اللہ بن احمد ایرانی نسل کا ایک مشہور جغرافیہ داں ہے۔ اس کی پیدائش تیسری صدی کے شروع میں تقریباً ۲۱۱ھ مطابق ۸۲۶ء میں ہوئی۔ اس کا دادا مجوسی تھا لیکن اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اس کا باپ والی طبرستان کے منصب پر مامور رہا تھا۔ ابن خرداذبہ کی اپنی زندگی کے متعلق بھی ہمیں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ عباسی خلیفہ معتمد (م: ۲۷۸ھ) نے اسے اپنا مقرب بنالیا تھا اور اس کا شمار خلیفہ کے خاص مصاحبوں میں ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں اسے صوبہ جبال (موجودہ ایران) میں ڈاک اور خبر رسانی کے محکمے کے ناظم کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ مشہور مؤرخ المسعودی نے آلات موسیقی، غنا، توقیع (تال) اور رقص کے موضوع پر اس کی ایک تقریر نقل کی ہے، جو اس نے خلیفہ کے دربار میں کی تھی۔ اس نے علم موسیقی اسحاق موصلی سے حاصل کیا تھا، جو اس کے والد کا دوست تھا۔

اس نے کئی کتابیں لکھی تھیں، جن میں سے بعض غیر معمولی عالمانہ نوعیت کی تھیں۔ ایک کتاب اس نے ایرانیوں کے انساب کے متعلق لکھی تھی، اور بعض دوسری کتابیں شکار، موسیقی، شراب، کھان پان اور ہمنشینی کے آداب سے متعلق لکھی تھیں، لیکن یہ کتابیں مفقود ہیں۔ اس کی مشہور اور مطبوع کتاب "المسالک والممالک" ہے۔ المسالک والممالک عربی زبان میں جغرافیہ کی پہلی کتاب ہے جس میں ہندوستان کا ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کو ابن خرداذبہ نے ایک عباسی شہزادے کی درخواست پر لکھا تھا۔ ابن خرداذبہ اگرچہ خود ہندوستان نہیں آیا تھا، مگر اس کی عام معلومات کی بنیاد بطلیموس[2] کے جغرافیہ پر ہے، اور خاص معلومات کے مواد اس نے سرکاری دفاتر سے جمع کیا تھا۔ ابن خرداذبہ چوں کہ ڈاک اور خبر رسانی کے محکمے کا ناظم تھا اور اس کے اس عہدے کی وجہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: ضیاء الدین اصلاحی، ہندوستان عربوں کی نظر میں، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء، ج ۱، ص ۴۔

[2] بطلیموس دوسری صدی عیسوی کا مشہور یونانی سائنس دان، ماہر فلکیات، جغرافیہ نگار، ریاضی دان، اسکندریہ (مصر) میں پیدا ہوا۔ فلکیات پر "المجسطی" Almagest اس کی بہت مشہور کتاب ہے۔ علم جغرافیہ پر بطلیموس کی عظیم تصنیف "جغرافیہ بطلیموس" بھی مشہور ہے۔

سے اکثر تاجروں اور مسافروں سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، اس لیے اس کی یہ ذاتی معلومات ایک چشم دید سیاح کی معلومات سے کم درجہ کے نہیں ہیں، اور اسی بنیاد پر اس کتاب کو سفر نامہ کے مانند شمار کیا جاتا ہے۔

ابن خرداذبہ نے اس کتاب کو تیسری صدی ہجری کے وسط میں لکھا ہے۔ یہ کتاب مقامی تاریخی جغرافیے کے بارے میں ایک اہم مأخذ ہے، اور بعد کے مصنفین میں ابن فقیہ ہمذانی صاحب کتاب البلدان، ابن حوقل صاحب کتاب صورة الأرض، المقدسی البشاری صاحب أحسن التقاسیم فی معرفة الأقالیم، جیہانی وزیر خراسان، شریف ادریسی صاحب نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق، البیرونی صاحب تحقیق ما للهند من مقولة اور دوسرے جغرافیہ نویسوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب کو پہلے بار بیئے دی مینار Barbier de Meynard نے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۶۵ء میں شائع کیا، اور دوبارہ ڈی گوئجے de Goeje نے اس کتاب کو ۱۸۸۹ء میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ بریل (لائڈن) سے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ ڈی گوئجے نے دوسرے نسخوں سے بھی استفادہ کیا۔ اس کے مطابق اس کتاب کا کوئی مکمل نسخہ موجود نہیں ہے۔ وہ اپنی تحقیقات کی رو سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ ابن خرداذبہ نے یہ کتاب ۲۳۲ھ مطابق ۸۴۶ - ۸۴۷ء میں لکھی تھی، اور پھر رفتہ رفتہ اس میں اضافے کرتا رہا اور اس طرح یہ کتاب دوسری دفعہ شائع ہوئی، اگرچہ اس کی اشاعت کی تکمیل ۲۷۲ھ مطابق ۸۸۵ - ۸۸۶ء سے پہلے نہیں ہو سکی۔ ابن خرداذبہ کی اس کتاب کا ترکی ترجمہ شریف ابن محمد نے ایک فارسی ترجمے سے کیا تھا۔ حاجی خلیفہ کے مطابق ابن خرداذبہ کی وفات تقریباً ۳۰۰ھ مطابق ۹۱۲ - ۹۱۳ء میں ہوئی[۴]۔

کتاب کے شروع میں ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں زمین کی صفات، اس کی ساخت، مختلف ممالک میں سمت قبلہ، اور لوگوں کی آمد و رفت کے راستوں اور مسافتوں کے علاوہ دوسری تاریخی معلومات بھی درج ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں اسلامی ملکوں پر گفتگو کرتے ہوئے عراق کی زمین پر مرکزی حیثیت کے بارے میں لکھا ہے، پھر اس نے مشرقی اور مغربی

---

[۴] ابن خرداذبہ کے حالات زندگی اور اس کی کتاب "المسالک والممالک" کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: حاجی خلیفہ، کشف الظنون، دار إحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۴۱ء، ج ۲، ص ۱۶۶۵ ؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، طبع اول ۱۹۶۴ء، ج ۱، ص ۵۰۰-۵۰۱؛ ہندوستان عربوں کی نظر میں، ج ۱، ص ۸۔

اسلامی ممالک کے بارے میں اہم معلومات بیان کی ہیں۔ شمالی اور جنوبی ممالک کا تذکرہ کرتے ہوئے حرم کی سرحدوں پر بھی روشنی ڈالی ہے[۴]۔ زمین کے فطری، قدرتی اور مصنوعی عجائبات کے ساتھ ساتھ نہروں کے راستوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ہندوستان اور دیگر پڑوسی ملکوں کے تجارتی برّی و بحری راستوں کی تفصیلات اور یہاں کی مختلف ذاتوں کو بھی بیان کیا ہے۔ ابن خرداذبہ نے اس کتاب میں ہندوستان کا بہت خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں اس نے کشمیر سے خانہ کعبہ کا رُخ بتایا ہے اور یہ بھی ذکر کیا کہ سرندیپ[۵] میں ایک پہاڑ ہے جس پر حضرت آدم علیہ السلام (جنت سے) اترے تھے۔ ہندوستانی برہمنوں اور جوگیوں کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس پہاڑ کے پتھر پر حضرت آدم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات پائے جاتے ہیں[۶]۔ اس نے مزید تصریح کی ہے کہ ہندوستان کی عود کی لکڑی، عنبر، مشک، صندل، کافور، جائے پھل، لونگ، ادرک، کالی مرچ، ناریل اور باریک مخملی سوتی کپڑے بے حد مشہور ہیں اور مصنف کے زمانے میں ان چیزوں کی ہندوستان سے برآمد ہوتی تھی[۷]۔ ہندوستانی راجاؤں کے القاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں کے سب سے بڑے راجہ کا لقب "بلہرا" یعنی مہاراجہ ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کے راجہ اور باشندے زنا کو مباح اور شراب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر قمار (راس کماری) کا راجہ زنا اور شراب دونوں کو حرام سمجھتا ہے۔ اس نے یہ بھی خبر دی کہ سری لنکا کے راجہ کے لیے عراق سے شراب جاتی ہے، اسی کو وہ پیتا ہے۔ اسی طرح یہ ذکر بھی ہے کہ ہندوستانی راجہ قد آور ہاتھی پالنے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اور انہیں بڑی بڑی قیمتیں اور بہت سا سونا دے کر خریدتے ہیں[۸]۔

ہندوستانیوں اور یہاں کے طبقاتی نظام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کی سات قسمیں (ذاتیں) ہیں:

(۱) چھتری: یہ یہاں کے شرفا ہیں۔ انہی میں سے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ان کو سب ہندوستانی سجدہ

---

[۴] ابن خرداذبہ، المسالک والممالک، بریل، لائڈن، ۱۸۸۹ء، ص ۴-۵۔

[۵] سرندیپ یعنی موجودہ جزیرۂ سری لنکا (سیلون)۔ اس کے بارے میں بعض مؤرخین نے کہا ہے کہ یہ پہلے ہندوستان کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ دیکھیے: سلیمان التاجر کی کتاب سلسلۃ التواریخ، ص ۵۰۔

[۶] المسالک والممالک، ص ۶۴۔

[۷] المسالک والممالک، ص ۶۱۔

[۸] المسالک والممالک، ص ۶۷۔

کرتے ہیں اور یہ کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔

(۲) برہمن: یہ شراب اور نشہ آور چیزیں استعمال نہیں کرتے۔

(۳) کھتری: یہ لوگ تین پیالوں تک پی لیتے ہیں۔ برہمن اپنی لڑکیوں کی ان سے شادی نہیں کرتے، مگر ان کی لڑکیوں سے اپنی شادی کر لیتے ہیں[۹]۔

(۴) شودر: یہ زراعت اور کھیتی کرتے ہیں۔

(۵) بیش (ویش): یہ اہل حرفہ اور پیشہ والے لوگ ہیں۔

(۶) چنڈال: یہ کھلاڑی اور کلاونت ہیں، ان کی عورتیں خوبصورت ہوتی ہیں۔

(۷) ڈوم: یہ گانے بجانے اور کھیل تماشہ کرنے والے لوگ ہیں، ان کا رنگ گندمی ہوتا ہے[۱۰]۔

ہندوستانی ادیان و مذاہب پر روشنی ڈالتے ہوئے ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ۴۲ قسم کے مذاہب ہیں۔ بعض خدا اور رسول کو مانتے ہیں۔ بعض خدا کو تو مانتے ہیں مگر رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ بعض نہ خدا کے قائل ہیں نہ رسول کے۔ ان کا گمان ہے کہ جھاڑ پھونک اور منتر کے ذریعہ مرادیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ وہ بیماری میں جھاڑ پھونک سے علاج کراتے ہیں اور اسی کا پانی بھی پلاتے ہیں۔ ان کا اوہام و تخیلات پر عقیدہ ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسی سے ان کو نفع اور نقصان پہنچتا ہے، اور وہ ایسی ایسی خیالی چیزیں ظاہر کرتے ہیں جن کو دیکھ کر عقلمند حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ بارش اور سردی روک دینے کے مدعی ہیں[۱۱]۔

ابن خرداذبہ نے ہندوستان سے متصل بعض علاقوں کے نام ذکر کرتے ہوئے خراسان سے سندھ اور ہندوستان کی مسافت کو بتایا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ دریائے سندھ سے اوتگین چار دن کا راستہ ہے اور یہیں سے ہندوستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ ہندوستانی شہروں کے نام بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہاں کے مشہور شہروں میں سامل، ہورن (اجین) قالون، قندھار اور کشمیر ہیں۔ اس نے عمان، سندھ، ہندوستان اور چین کے تجارتی راستوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، یہ بھی ذکر کیا ہے کہ دریائے سندھ کا مخرج شقنان کا ایک پہاڑ ہے اور یہ کہ دریائے سندھ، دریائے جیحون کی ایک شاخ ہے اور ہندوستان کے بعض علاقے اس کی طرف منسوب ہیں[۱۲]۔

---

[۹] چھتری اور کھتری کے درمیان مصنف نے فرق کیا ہے حالاں کہ دونوں ایک ہی ذات ہیں۔

[۱۰] المسالک والممالک، ص ۷۱۔

[۱۱] المسالک والممالک، ص ۷۱-۷۲۔

[۱۲] المسالک والممالک، ص ۶۸، ۷۳، ۱۷۳-۱۷۴۔

سلسلۃ التواریخ: سب سے پہلا باقاعدہ سفر نامہ جو کسی عرب سیاح کا ہم تک پہنچا ہے وہ سلیمان التاجر کا سفر نامہ "سلسلۃ التواریخ" ہے۔ اس سفر نامے کو "اَخبار الصین والھند" (چین اور ہندوستان کے احوال) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اسے اگرچہ سلیمان التاجر نے لکھا تھا لیکن اسے اس کے ہم وطن ابوزید حسن السیرافی نے مدوّن و مکمّل کیا۔ یہ سفر نامہ بعد کی صدیوں میں جغرافیہ کے ماہرین اور جہاز رانوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ تیسری صدی ہجری کے نصف اوّل میں متعدد عرب تاجرین نے ہندوستان کا سفر کیا، مگر ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ سلیمان التاجر کی پیدائش اور وفات کا سن نہیں معلوم ہو سکا۔ سلیمان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ ایک ایرانی تاجر تھا اور خلیج فارس کے ساحلی علاقہ میں سیراف نامی بندر گاہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے عراق کی بندر گاہ سے ہندوستان اور چین کا سفر کیا اور اپنے سفر کی تفصیلات کو عربی زبان میں قلم بند کیا[۱۳]۔ فارسی مؤرخ الحورانی کے مطابق ۲۳۷ھ / ۸۵۱ء میں ایک نامعلوم مصنف نے سیراف سے خانفُوا (بندر گاہ کینٹن، چین) تک کے سمندری راستے کی تفصیلات تحریر کیں اور ہندوستانیوں اور چینیوں کے رسم و رواج کے بارے میں تاجروں کی رپورٹوں کو جمع کیا۔ بعد میں یہ کتاب أخبار الصین والھند کے نام سے مشہور ہوئی اور اسے سلیمان التاجر کی طرف منسوب کیا گیا[۱۴] فرانسیسی عالم اور مستشرق رینو اس کتاب کو سلیمان التاجر کی تصنیف قرار دیتا ہے۔ اپنے سفر نامے میں سلیمان نے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت، تمدن و سیاست، یہاں کے راجاؤں، بعض تعزیری قوانین ذکر کیا ہے اور ملک چین سے ہندوستان کا موازنہ کیا ہے۔

سلیمان التاجر کے ۶۵/ سال بعد ابوزید حسنالسیرافی نے سلیمان کا سفر نامہ پڑھا، اور ابن وہب قریشی نام کے ایک شخص سے چین کے بارے میں بہت سی معلومات لے کر اس سفر نامے میں اضافہ کیا[۱۵]۔ ہم ابوزید السیرافی کے خاندان اور اس کی زندگی (یعنی اس کی پیدائش اور موت) کے

---

[۱۳] ہندوستان عربوں کی نظر میں، ج ۱، ص ۲۵؛ خلیج فارس، احمد اقتداری بحوالہ سلسلۃ التواریخ مترجم فارسی ڈکترحسین قرچانلو، مرکز تحقیقات کمپیوتری علوم اسلامی ایران، ص ۱۴، سن اشاعت مذکور نہیں۔

[۱۴] دریانوردی عرب در دریای هند (در روزگار باستان و در نخستین سده‌های میانه) ص ۹۱، بحوالہ سلسلۃ التواریخ، مترجم فارسی ڈکترحسین، ص ۱۴۔

[۱۵] خلیج فارس، اقتداری، ص ۹۰، بحوالہ سلسلۃ التواریخ، مترجم فارسی، ص ۱۵۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ ابوزید حسن السیرافی نے سلیمان التاجر کے سفر نامے کا ۲۵-۳۰ برس کے بعد تکملہ لکھا۔ دیکھیں: ہندوستان عربوں کی نظر میں، ج ۱، ص ۴۶۔

بارے میں بھی زیادہ نہیں جانتے۔ مگر وہ چوتھی صدی ہجری کے نصف اوّل میں زندہ تھا۔ خلیج فارس کی مشہور بندر گاہ سیراف کا رہنے والا تھا۔ یہیں پر مشہور مؤرخ اور سیّاح ابوالحسن المسعودی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ المسعودی کے مطابق ابو زید نے اپنی زندگی کا آغاز، یعنی بچپن اور جوانی اپنے آبائی شہر سیراف میں گزاری، پھر ۳۰۳ ہجری میں اس نے بصرہ ہجرت کی اور وہیں سکونت اختیار کر لی[۱۶]۔ ابوزید کوئی مسافر یا عالم نہیں تھا، لیکن بظاہر وہ سمندری کہانیوں اور افسانوں کا دلدادہ تھا، جن میں سے بہت سی کہانیاں اس زمانے میں لوگوں میں عام تھیں اور ابوزید کے لئے ان کو جمع کرنا مشکل نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوزید السیرافی نے سلیمان التاجر کی تصنیف میں ابن وہب نامی شخص کی معلومات کو شامل کرنے کے بعد اس کتاب کا أخبار الصين والهند نام رکھا۔

نفیس احمد لکھتے ہیں کہ: "ابوزید السیرافی نے ہندوستان اور چین کے بارے میں لکھی گئی کتاب کا نام أخبار الصين والهند رکھا اور ہندوستان کے جغرافیائی، سماجی اور اقتصادی حالات کے بارے میں اوّلین معلومات فراہم کیں"[۱۷]۔ ابوزید کے ہم عصر اور مشہور مؤرخ وسیاح المسعودی نے ابوزید اور سلیمان کی خبروں کی تصدیق کی ہے۔ بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابوزید سے المسعودی کی کم ازکم دوبار ملاقات ثابت ہے اور دونوں نے ہندوستان اور چین سے متعلق معلومات کا آپس میں تبادلہ بھی کیا[۱۸]۔

ابو زید السیرافی نے اپنے تکملہ میں ہندوستان کے رسم و رواج، تمدّن و معاشرت، مذہبی اعتقادات، بت خانوں اور راجاؤں کے حالات وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اصل کتاب اور اس کے تکملہ کو فرانسیسی عالم رینو Reinaud نے ۱۸۴۵ء میں پہلی بار پیرس سے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کو اپنے تنقیدی مقدّمہ کے ساتھ سلسلة التواريخ کے نام سے شائع کیا۔

تیسری صدی ہجری میں عربوں کے ہندوستان اور چین کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار تھے۔ عربوں کے جہاز خلیج فارس کی مشہور بندرگاہ سیراف اور بصرہ سے چل کر بحر ہند سے گزر کر چین تک جاتے تھے۔ عرب تاجرین اور جہاز راں ان خطرناک راستوں سے سفر کرتے تھے۔ بلکہ اسلامی دور میں خلیج فارس میں بصرہ اور سیراف کی دونوں بندر گاہوں اور دیگر بازاروں کی ترقی وخوشحالی

---

[۱۶] ابوالحسن علی المسعودی، مروج الذهب ومعادن الجوهر، دار الفکر، مصر ۱۹۷۳، جزء اول، ص ۱۴۵۔

[۱۷] نفیس احمد، خدمات مسلمانان بہ جغرافیا، ص ۷۲، بحوالہ سلسلة التواریخ، مترجم فارسی، ص ۱۵۔

[۱۸] آرنلڈ ویلسن، خلیج فارس، ص ۷۲، مجلہ معارف اسلامی (علم جغرافیا و تطورات آں در جھانِ اسلام)، چاپ قم، ش ۱، ص ۱۰۷، بحوالہ سلسلة التواریخ، مترجم فارسی، ص ۱۵۔

کی بنیاد ان دونوں ممالک یعنی ہندوستان اور چین کے ساتھ براہِ راست تجارت کی وجہ سے تھی[۱۹]۔
اس سفر کی تفصیل سلیمان التاجر ان الفاظ میں کرتا ہے:

وہ سمندر جو ہندوستان، چین اور سراندیپ کے بیچ میں ہے، اس میں بڑی بڑی مچھلیاں ہوتی ہیں، جن سے جہاز ڈرتے ہیں۔ رات کو جب اس میں جہاز چلتے ہیں تو گھنٹہ بجاتے ہیں تاکہ یہ مچھلیاں راستے سے ہٹ جائیں۔ اس میں بیس ہاتھ کی ایک مچھلی ہم نے شکار کی اس کا نام وال (وہیل) ہے[۲۰]۔

اس زمانے میں ہندوستان کی صنعت وحرفت کو بیان کرتے ہوئے سلیمان التاجر لکھتا ہے:

تیسرا سمندر ہرگند (بحر ہند) ہے۔ اس میں بکثرت جزیرے ہیں۔ ان پر ایک عورت کی حکومت ہے۔ ان جزیروں میں عنبر بہت ملتا ہے اور ان میں ناریل کی بڑی کثرت ہے۔ یہاں کے باشندے صنّاعی میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ کپڑے مع آستین، دامن اور کلیوں کے بنتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ جہاز سازی، تعمیر اور تمام صنعتوں میں بھی کمال رکھتے ہیں[۲۱]۔

سلیمان التاجر اہل ہند کی شرافت اور طبعی خودداری اور ان کے راجاؤں کے اصولوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اہل ہند لہو و لعب کو معیوب سمجھتے ہیں اور آلات لہو کا استعمال نہیں کرتے۔ وہ شراب نہیں پیتے اور نہ سرکہ کھاتے ہیں کیوں کہ سرکہ بھی شراب میں شامل ہے۔ یہ سب چیزیں اگرچہ ان کے دین میں ممنوع نہیں ہیں مگر اپنی شرافت اور طبعی خودداری کی وجہ سے ان کا استعمال نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو راجہ شراب پیے وہ حقیقت میں راجہ نہیں ہے کیوں کہ ان کے گردوپیش میں جو راجہ ہیں وہ ان سے لڑتے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ کوئی مدہوش اور شراب میں سرشار و سرمست راجہ کس طرح اپنے ملک کا نظم ونسق درست رکھ سکتا ہے[۲۲]۔

ہندوستان کی عادات واطوار کا ذکر کرتے ہوئے سلیمان لکھتا ہے:

ہندوستانی روزانہ ناشتہ سے پہلے غسل کرتے ہیں اس کے بعد کھاتے ہیں۔ وہ زمانۂ حیض میں عورتوں کے پاس نہیں جاتے۔ ہندوستانی مسواک کرتے ہیں اور کوئی شخص مسواک اور غسل

---

[۱۹] احمد اقتداری، از دریای پارس تا دریای چین، ص ۲۷، بحوالۂ سلسلۃ التواریخ، مترجم فارسی دکتر حسین قرچانلو، ص ۱۳-۱۴۔

[۲۰] سلیمان التاجر، سلسلۃ التواریخ، پیرس، دار الطباعۃ السلطانیۃ، ۱۸۱۱ء، ص ۲-۴۔

[۲۱] سلسلۃ التواریخ، ص ۵-۶۔

[۲۲] سلسلۃ التواریخ، ص ۵۲۔

کیے بغیر کھانا نہیں کھاتا[۲۳]۔

ابوزید حسن السیرافی نے ہندوستانی حکمت ودانش کے متعلق چینی بادشاہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

> چینی بادشاہ نے عرب کے قبیلۂ قریش کے ایک آدمی سے اپنے دربار میں دنیا کے بڑے بڑے اور قابل ذکر شہنشاہوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ چوتھے نمبر پر ترکوں کے بعد ہاتھیوں والا یعنی ہندوستانی بادشاہ ہے، اور ہم لوگ اسے حکمت و دانائی کا راجہ سمجھتے ہیں کیوں کہ سرزمین ہند حکمت ودانش کا مرکز و منبع ہے[۲۴]۔

عجائب الھند برّہ وبحرہ: تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا بزرگ بن شہریار کا سفر نامہ "عجائب الھند برّہ وبحرہ" اس زمانے کے ہندوستان کے احوال اور یہاں کے لوگوں کے عادات واطوار کو جاننے کے لیے ایک مستند وثیقہ کی حیثیت سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ بزرگ بن شہریار اس عہد کا ایک ایرانی ناخدا (جہاز راں) تھا جو اپنے جہاز عراق کے بندر گاہ سے ہندوستان کے ساحلوں اور جزیروں تک اور وہاں سے لے کر چین اور جاپان جاتا اور آتا تھا۔ اس نے اپنی یہ کتاب "عجائب الھند" عربی زبان میں لکھی جس میں اس نے اپنے اور اپنے دوسرے ساتھیوں، مسافروں اور سیاحوں کے بحری مشاہدات، حادثات اور مشکلات کو بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں جو حکایتیں درج ہیں وہ سن ۲۸۸ سے ۳۴۲ ہجری کے درمیان پیش آئیں۔ اس کتاب میں جنوبی ہند اور گجرات کے متعدد واقعات کا ذکر ہے اور یہاں کے جوگیوں اور سنیاسیوں کی ریاضتوں کا بھی ذکر ہے۔ بزرگ بن شہریار کے زمانے میں بحر ہند میں عربوں کی جہاز رانی عروج پر تھی۔ "عجائب الھند" میں متعدد واقعات اور حکایتیں درج ہیں، جن میں بعض بے حد تعجب خیز اور بعید از قیاس بھی ہیں۔ مثال کے طور پر جزیرہ کے مانند کچھوا، بلی کے برابر چیونٹی، تناور درخت کے مانند سانپ، غیر معمولی بڑا اور طاقتور پرندہ جو آدمی کو اپنے پیروں میں دبا کر جزیروں کے درمیان پرواز کر سکتا ہے، اور ان جیسے دیگر واقعات ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں۔ اس قسم کے عجیب وغریب واقعات کو سن کر اور سنا کر اس زمانے کے ناخدا اور دریائی مسافرین اپنے مشکل ترین سفر کے اوقات گزارتے تھے، اور حکایت بیان کرنے والے کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اصل واقعہ کو ملمع سازی کے ساتھ پیش کرے تاکہ سامعین زیادہ توجہ اور غور کے ساتھ اس کی باتوں کو سنیں اور

---

(۲۳) سلسلۃ التواریخ، ص ۵۷۔

(۲۴) سلسلۃ التواریخ، ص ۷۹۔

یوں حقیقی واقعات میں افسانوی رنگ کی آمیزش ہوگئی۔ لیکن خود بزرگ بن شہریار نے ان واقعات کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا ہے حالاں کہ وہ خود ایک جہاز راں اور سیاح تھا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سچے واقعات کی تلاش و جستجو کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کتاب میں جو بھی عجیب اور بعید از قیاس باتیں آئی ہیں وہ سب افسانے ہیں، بلکہ ان افسانوں کے درمیان ایسے تاریخی حقائق بھی ملتے ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بزرگ بن شہریار کے زمانے میں بحر ہند میں عربوں کی جہاز رانی ترقیوں کی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ اس زمانے کے جو مشہور جہاز راں اور کپتان ہوتے تھے ان کی معلومات بھی اس کتاب کے ذریعے ہمیں ملتی ہیں۔ یوں اس زمانے میں ہندوستان کے جن علاقوں میں عربوں کے جہازوں کی آمد و رفت تھی، وہاں کے حالات، ان شہروں میں بسنے والے لوگوں کے عادات و اطوار، وہاں کے لوگوں کی تجارتوں کے بارے میں بھی اطلاع ملتی ہے۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں جہاز رانی کے رائج طریقوں اور مشہور بندرگاہوں سے بھی ہمیں آگاہی ہوتی ہے، ان میں سب سے اہم واقعہ کشمیر کے ایک ہندو راجہ کا قرآن کا مقامی زبان میں ترجمہ کرا کر سننا ہے۔ وہ راجہ اسلام کی تعلیمات سن کر دل و زبان دونوں سے اسلام قبول کر چکا تھا، لیکن حکومت چھن جانے کے خوف سے اس کا اعلان نہیں کر سکا[۲۵]۔

مصنف کتاب نے سری لنکا کے باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی طرف بڑا میلان رکھتے ہیں۔ سری لنکا کے باشندے اس زمانے میں پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ اس تواضع و خاکساری کی وجہ بیان کرتے ہوئے بزرگ بن شہریار لکھتا ہے:

> سری لنکا اور اس کے آس پاس والوں کو جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنی قوم کے ایک سمجھدار اور ہوشیار آدمی کو بھیجا کہ وہ آپؐ کے پاس جا کر آپؐ کا حال اور جس چیز کی آپؐ دعوت دیتے ہیں، اس کو معلوم کرے۔ لیکن اس آدمی کو رکاوٹیں پیش آ گئیں اور وہ اس وقت مدینہ پہنچا جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ دونوں وفات پا چکے تھے۔ چنانچہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رسول کریم ﷺ کے حالات دریافت کیے۔ آپؓ نے ان کے حالات پوری تفصیل سے بیان کیے۔ مگر جب یہ آدمی واپس ہوا تو مکران کے علاقے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ہمراہ ایک ہندو لڑکا بھی گیا تھا۔ اس نے سری لنکا پہنچ کر سب حالات بیان کیے اور نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے

---

[۲۵] بزرک بن شہریار، عجائب الھند، مصر، مطبع السعادۃ، الطبعۃ الاُولی ۱۹۰۸م، ص ۳-۴۔

متعلق جو کچھ واقفیت حاصل ہوئی تھی وہ سب بیان کی اور بتایا کہ اس کی ملاقات رسول اللہ ﷺ کے ساتھی اور قائم مقام حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی اور ان کی خاکساری کا حال بھی بیان کیا کہ وہ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور رات مسجد میں گزار دیتے ہیں۔ انہی واقعات کو سن کر اور اس کے اثر سے یہ لوگ تواضع و خاکساری کے لیے پیوند لگے ہوئے کپڑے پہننے لگے۔ یہ لوگ مسلمانوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کی طرف میلان رکھتے ہیں[۲۶]۔

ہندوستان کے بعض علاقوں میں بعض ہندو حکومتوں میں حکومت کی جانب سے مسلمانوں کا نظام قائم تھا اور ان کے علماء و مفتی مقرر تھے جو ان کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کو ہنرمند کہا جاتا تھا۔ بزرگ بن شہریار لکھتا ہے:

اہل ہند کے نزدیک چوری کی سزا قتل ہے اور اگر کوئی مسلمان اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا معاملہ مسلمانوں کے ہنرمند کے یہاں پیش کر دیا جاتا ہے تاکہ اسلامی قانون کے مطابق اس کے ساتھ کارروائی کی جائے اور ہنرمند کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو اسلامی ملکوں میں قاضی کی ہے اور ہنرمند صرف مسلمان ہوتے تھے[۲۷]۔

اس کتاب کو وان درلیت نے ایڈٹ کر کے فرنچ ترجمہ کے ساتھ مطبع بریل لائڈن سے پہلی بار ۱۸۸۳ء- ۱۸۸۶ء میں شائع کیا۔ کتاب کا فرنچ ترجمہ مارسیل دیوک نے کیا ہے۔ وان درلیت کی ایڈٹ کردہ کتاب کی بنیاد قسطنطنیہ کی لائبریری میں موجود محمد القطان کے قلمی نسخے پر ہے جسے انہوں نے ۴۰۴ھ ہجری میں تحریر کیا ہے۔ یہ محقق و مترجَم کتاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی لائبریری میں موجود ہے[۲۸]۔

مروج الذھب و معادن الجوھر: ہندوستان کے ذکر اور یہاں کے شہروں اور دریاؤں کے متعلق ابوالحسن علی المسعودی کی کتاب "مروج الذھب و معادن الجوھر" میں بڑی مفید معلومات موجود ہیں۔ ان کا وطن بغداد تھا اور ان کا خاندانی سلسلہ مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، اس لیے ان کو المسعودی کہا جاتا ہے۔ المسعودی ایک بلند پایہ مؤرخ، جغرافیہ نویس اور سیاح کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کے پچیس سال سیر و سیاحت میں گزارے۔ انھوں

---

[۲۶] عجائب الھند، ص ۱۱۷-۱۱۸۔

[۲۷] عجائب الھند، ص ۱۲۱۔

[۲۸] راقم السطور نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

نے بغداد سے سفر شروع کیا اور عراق، شام، آرمینیا، روم (ایشیائے، کوچک)[۲۹]، افریقہ[۳۰]، سوڈان اور حبشہ (ایتھوپیا) کے علاوہ چین، تبت، ہندوستان اور سری لنکا بھی گئے اور ان ملکوں کے دریاؤں کی بھی سیر کی۔ان کی متعدد کتابوں میں زیادہ تر تصانیف ضائع ہو چکی ہیں۔ آخر عمر میں المسعودی نے مصر میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اور وہیں ۳۴۶ھ میں انھوں نے وفات پائی[۳۱]۔

اپنی کتاب "مروج الذهب" میں المسعودی نے اپنے پیشرو مصنفین کے علوم وفنون سے استفادہ کرتے ہوئے بہت ساری مفید معلومات کو مختصر انداز میں پیش کیا ہے۔ تاریخی معلومات کے بیان میں انہوں نے اختلاف علماء کو بھی ان کے اقوال ودلائل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں دو قسم کے مصادر سے استفادہ کیا ہے۔ پہلی قسم میں وہ کتابیں ہیں جو دیگر مصنفین نے ان سے پہلے تصنیف کی تھیں۔ المسعودی نے ان کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی قدر وقیمت بتائی ہے۔ کتاب کے مقدمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں اپنے زمانے میں موجود تاریخ، سیاست اور معاشرہ سے متعلق دسیوں کتابوں سے استفادہ کیا ہے، مگر ان میں سے بہت کم کتابیں ہم تک پہنچ پائی ہیں۔ اس کتاب میں دوسری قسم کے ماخذ لوگوں کی وہ باتیں ہیں جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے سن کر نقل کیا ہے۔ اس سلسلے میں المسعودی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ راوی کا نام، اس کا وطن اور ہجری تاریخ بھی ذکر کرتے ہیں۔ وہ راوی سے اس کے شہر کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اور وہاں کی عادات و اطوار، نہروں، چشموں اور دیگر ضروری امور کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کرتے ہیں[۳۲]۔ انھوں نے اس کتاب میں بار بار اپنی سابقہ کتابوں کا حوالہ دے کر قارئین کو ان کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ مگر افسوس کہ ان کی اکثر تصنیفات ضائع ہو گئیں۔ ہر موضوع کے آخر میں المسعودی نے اپنی کتاب "اخبار الزمان" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس باب میں ہم نے اختصار سے کام لیا ہے اور اس بارے میں ہم نے اپنی کتاب "اخبار الزمان" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بعض علماء کا بیان ہے

---

[۲۹] یعنی موجودہ ترکی۔ "روم" سے تاریخی بیزنطینی شہنشاہیت مراد ہے نہ کہ موجودہ روم جو اٹلی کی راجدھانی ہے۔

[۳۰] عرب مؤرخین "افریقہ" (إفريقيه) شمالی افریقہ کو کہتے تھے۔

[۳۱] المسعودی کی زندگی اور ان کی تصنیفات کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: الفہرست لابن الندیم، دار المعرفة، بیروت، ص ۲۱۹-۲۲۰، سن اشاعت مذکور نہیں؛ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۴ء، ج ۲۱، ص ۱۸-۲۰۔

[۳۲] ابو الحسن علی مسعودی، مروج الذهب و معادن الجوهر، دار الفکر ۱۹۷۳م، ج ۱، ص ۳-۴۔

کہ کتاب "اخبار الزمان" تیس جلدوں میں تھی مگر سوائے ایک جلد کے باقی کا پتہ نہیں چلتا۔ المسعودی نے جو بعض تاریخی اور جغرافیائی معلومات تحریر کی ہیں، وہ ان سے پہلے کے مؤرخین اور جغرافیہ نویسوں کے یہاں نہیں ملتی ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے "مروج الذھب" کی اہمیت تاریخی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ المسعودی نے اسے ۳۳۲ھ مطابق ۹۴۳ء میں سیر و سیاحت ختم کرنے کے بعد لکھا تھا اور وہ مصر سے کئی بار شائع ہوئی۔ پیرس سے نو جلدوں میں ۱۸۷۱ء میں فرنچ ترجمے کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور ۱۸۴۱ء میں لندن سے اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے۔

"مروج الذھب" نہایت پر معلومات اور مفید تصنیف ہے۔ اگرچہ وہ اسلام کی تاریخ ہے لیکن کتاب کے مقدمے میں انہوں نے دنیا کی تمام قدیم اقوام جیسے ایرانی، سریانی، یونانی، رومی، یوروپین، عرب اور ان کے ادیان و مذاہب، عادات و اطوار کی اجمالی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کا ذکر اور یہاں کے شہروں اور دریاؤں کے متعلق اس میں بڑی مفید معلومات موجود ہیں۔ انھوں نے بحر ہند کے مسافروں کی کہانیاں تفصیل سے لکھی ہیں۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> اس (مسعودی) کے بیان سے یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح آج جہاز راں کمپنیوں اور ان کے جہازات کے نام ہوتے ہیں اسی طرح جہازوں کے مالکوں کی نسبت سے بھائیوں اور بہنوں اینڈ برادرز اینڈ سنز کے طریقہ سے ان جہازوں کے نام بھی رکھے جاتے تھے جو بحر ہند میں آتے جاتے تھے۔ اس نے سب سے پہلے دریائے رائد (راوی) اور گنگا اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کا بار بار نام لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کہاں کہاں سے نکلا ہے[۳۳]۔

مصادر و مراجع

۱۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، طبع اول ۱۹۶۴ء، ج ۱۔

۲۔ سلیمان التاجر، سلسلۃ التواریخ، پیرس، دار الطباعۃ السلطانیۃ، ۱۸۱۱ء۔

۳۔ سلسلۃ التواریخ، مترجم فارسی دکتر حسین قرچانلو، مرکز تحقیقات کمپیوتری علوم اسلامی، ایران، سن اشاعت مذکور نہیں۔

۴۔ بزرک بن شہریار، عجائب الھند، مصر، مطبع السعادۃ، الطبعۃ الاولی، ۱۹۰۸ء۔

۵۔ سید سلیمان ندوی، عرب وہند کے تعلقات، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء۔

۶۔ ابن الندیم، الفہرست، دار المعرفۃ، بیروت، سن اشاعت مذکور نہیں۔

۷۔ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۴۱ء۔

۸۔ ابن خرداذبہ، المسالک والممالک، مطبع بریل، لائڈن، ۱۸۸۹ء۔

۹۔ ابو الحسن علی المسعودی، مروج الذھب ومعادن الجوھر، دار الفکر، مصر، ۱۹۷۳ء۔

۱۰۔ ضیاء الدین اصلاحی، ہندوستان عربوں کی نظر میں، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۹ء۔

---

(۳۳) سید سلیمان ندوی، عرب وہند کے تعلقات، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی کی کتاب: المرتضیٰؓ

پروفیسر مسعود عالم فلاحی
سابق وائس چانسلر، صدر شعبۂ عربی، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ
masoodfalahi@gmail.com

حضرت امیر المؤمنین علیؓ کرّم اللہ وجہہ کو اللہ تعالی نے جن خصوصیات و کمالات سے نوازا تھا، ان کا تقاضا یہ ہے کہ دفتر پر دفتر لکھتے چلے جایئے مگر ان کے فضائل و مناقب کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کی تاریخ کا یہ وہ روشن ستارہ ہے جو جاہلیت کی تاریکی میں چمکا، اور جس کی روشنی سے پوری دنیا منور ہوئی۔ ان کی بہادری کے سامنے بڑے بڑے پہلوان منہ کے بل گرے، ان کی فراست اور ذہانت اہل دانش کے لیے ایک مثال ہے۔ ان کی معاملہ فہمی اور سیاسی دانشمندی کی ایک دنیا قائل ہے۔

حضرت علیؓ پر مختلف زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، عربی زبان میں تو بے شمار کتابیں ہیں۔ سیرت نبویہ، تاریخ اسلام و سیر الصحابہ نیز حدیث کی تمام کتابیں جوامع، مسانید، سنن، صحاح، معاجم وغیرہ میں حضرت علیؓ کا مفصل تذکرہ آیا ہے۔ اسی طرح آثار صحابہؓ اور کتب فقہیہ بھی حضرت علیؓ کے اقوال اور ان کے فیصلوں سے بھرے پڑے ہیں۔

حضرت علیؓ کی شخصیت ایک جامع شخصیت تھی، وہ سابقین اولین کی صف اول میں تھے اور میدان میں بھی سب سے آگے رہنے والے تھے۔ فقہ و قضاء میں جماعت صحابہ میں سب سے بڑا مقام رکھتے تھے۔ وہ تصوف و سلوک کے بھی امام ہیں۔ تصوف کے سارے سلسلے (نقشبندیہ کو چھوڑ کر) آپ پر ہی منتہی ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے شروع سے ہی ان کی تربیت اور پرورش کی تھی، جس کی وجہ سے مزاج نبوت کو سمجھنے کا ایک خاص ملکہ ان میں پیدا ہو گیا تھا، اس لیے سیر و مغازی کا باب ہو یا فقہ و قضا کا، سیاست و حکومت کا معاملہ ہو یا زہد و تقوی کا، ہر میدان میں ان کی امامت تسلیم کی گئی۔

اس لیے ہر دور میں اہل علم و قلم نے، اس گوہر نایاب کی سیرت و سوانح، حالات و کمالات، اصول سیاست و حکمرانی، ان کی تقریروں اور فیصلوں کو جمع کرنے میں دلچسپی دکھائی۔ ہندوستان میں بھی، سیرت و تاریخ اسلام کے ذیل میں متعدد کتابوں میں حضرت علی المرتضی موضوع کتاب

رہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں بڑی تفصیل سے حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب بیان کیے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی الندویؒ کی کتاب "المرتضیٰ" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو پڑھنے والے اور ان کے فکر وفن سے واقف حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ دور حاضر کے ممتاز مفکر اور داعی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی خصوصیات وامتیازات سے نوازا تھا۔ وہ تصنیف وتالیف کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں کا اصل موضوع سیرت وتاریخ اسلام وفکر اسلامی ہے۔ اس لیے ہندو بیرون ہند میں ایک عظیم داعی، صاحب اسلوب اہل قلم اور دردمند مصلح کی حیثیت سے جانے اور پہچانے گئے۔

تالیف کا پس منظر: مولانا نے اس موضوع پر قلم کیوں اٹھایا؟ اس کے جواب میں وہ خود بہت ہی خوب صورت انداز سے اور بڑی تفصیل سے مقدمۂ کتاب میں لکھتے ہیں:

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سوانح حیات مرتب کرنے کا داعیہ کیسے پیدا ہوا، اس کے متعدد اسباب ہیں:

(پہلا سبب) ۱۹۵۵ یا ۱۹۵۶ء کا ذکر ہے کہ برادر معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ نے (جو اس وقت سے میرے مربی وسرپرست تھے جب کہ میری عمر نو سال تھی، اور میرے والد ماجدؒ کا انتقال ہوا تھا) ایک روز بڑے درد کے ساتھ گلوگیر آواز میں کہا: علی! تم کو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت پر کتاب لکھنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ یہ کام کر سکو"۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مشائخ و اولیاء اور اصحاب دعوت وعزیمت کی سیرت وسوانح حیات پر متعدد کتابیں میرے قلم سے نکل چکی تھیں اور زیور طبع سے آراستہ ہو چکی تھیں، جن میں سے بعض کے مجموعی صفحات ہزار سے زائد تھے۔ عمر کے لحاظ سے طبیعت میں جولانی اور عزم و ہمت میں نشاط و تابانی تھی، اور عربی کے ایک محاورہ کے مطابق "کمان چڑھی اور گھوڑے پر زین کسی تھی"، مگر یہ موضوع میرے لیے خاص عظمت و جلال رکھتا تھا۔ کسی اور موضوع پر لکھنے میں وہ تردد، احساس ذمہ داری اور کشمکش پیش نہیں آئی جو اس موضوع پر قلم اٹھانے میں محسوس ہوتی تھی؛ کیوں کہ اس نازک علمی و تاریخی سفر میں ایسے نازک موڑ اور اس درجہ سخت اور ہمت شکن گھاٹیاں آتی ہیں، جن سے کامیابی سے گزرنا آسان نہیں۔[1]

موضوع کی نزاکت: مولانا نے مقدمے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ موضوع بہت نازک

[1] ندوی، ابوالحسن علی: المرتضیٰ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱-۲۲۔

اور صبر آزما ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس دور میں افکار و نظریات کے اتنے ایڈیشن تیار ہوئے، واقعات اور حوادث کی اتنی مختلف توجیہات اور تاویلات سامنے آئیں کہ انسان محو حیرت رہ جاتا ہے اور ایک ایسے چوراہے پر کھڑا ہو جاتا ہے، جہاں سے منزل تک پہونچنا بغیر توفیق الٰہی کے ممکن نہیں۔ مولانا ابوالحسن علی رقم طراز ہیں:

> ایک ایسی اولوالعزم نادرۂ روزگار عبقری شخصیت پر قلم اٹھانا آسان نہیں جس کی اصل شخصیت افراط و تفریط اور اختلافات کے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہو اور جس کو ہر فریق نے اپنی خاص عینک سے اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے آئینے میں دیکھا ہو۔ یہاں تک کہ پوری زندگی چند متضاد خیالات و تصورات کا مجموعہ بن گئی ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نام تو ایک ہے مگر شخصیتیں متعدد بلکہ متضاد ہیں، اور اصل شخصیت اور اس کی عبقریت اب بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔[۲]

کتاب کا اجمالی تعارف: یہ کتاب عربی زبان میں ۱۹۸۸ء لکھی گئی، پھر مولانا سید عبداللہ عباس ندویؒ (سابق استاذ جامعۃ ام القری مکہ مکرمہ و سابق معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) نے اس کو اردو میں منتقل کیا۔

کتاب میں مقدمہ اور ضمیمہ کے علاوہ کل دس باب ہیں، جو درج ذیل ہیں:

باب اول: خاندان، پیدائش، ہجرت

باب دوم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ مدینہ میں، ہجرت سے وفات تک

باب سوم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں

باب چہارم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلافت فاروقی میں

باب پنجم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سیدنا عثمانؓ بن عفان کے دور خلافت میں

باب ششم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے دور خلافت میں

باب ہفتم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ خوارج اور اہل شام کے مقابلے میں

باب ہشتم: حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلافت کے بعد

باب نہم: جوانان اہل جنت کے سردار حسن اور حسین رضی اللہ عنہما

باب دہم: حضرات اہل بیت اور اولاد سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی پاکیزہ سیرتیں

---

[۲] حوالہ سابق، ص ۲۳-۲۴۔

ضمیمہ اولی: فرقۂ اثنا عشریہ کا عقیدۂ امامت

ضمیمہ ثانیہ: خلفائے اربعہ

اس طرح اردو میں یہ کتاب اس وقت ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مطالعے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ مولانا نے حضرت علیؓ کی سوانح کے ضمن میں، پورے عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین کو سامنے رکھا ہے، اور اس پورے عہد میں پیدا ہونے والی تحریکات اور واقعات کے باب میں ایک معتدل رائے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا نے مقدمہ میں اس کا اظہار بھی کیا ہے:

> ضرورت ایسی کتاب کی باقی ہے، جس میں وسیع پیمانے پر مختلف گوشوں کا انصاف کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہو اور لگے بندھے حدود سے نکل کر جدید تحقیقی اسلوب سے قلم اٹھایا گیا ہو، صرف انہی مواد و معلومات پر انحصار نہ رکھا گیا ہو، جو سوانح نگاروں نے اپنی کتابوں میں فراہم کر دیا ہے، مصنف کی ہمت بلند اور نگاہ وسیع ہو۔ ایک ایسی اولو العزم نادرۂ روزگار "عبقری" شخصیت پر قلم اٹھانا آسان نہیں، جس کی اصل شخصیت افراط و تفریط اور اختلافات کے پردوں کے پیچھے پوشیدہ ہو اور جس کو ہر فریق نے اپنی خاص عینک سے اپنے افکار و نظریات اور روایتی عقائد کے آئینے میں دیکھا ہو، یہاں تک کہ پوری زندگی چند متضاد خیالات و تصورات کا مجموعہ بن گئی ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نام تو ایک ہے؛ مگر شخصیتیں متعدد بلکہ متضاد ہیں اور اصل شخصیت اور اس کی عبقریت اب بھی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔[۳]

کتاب کے مضامین پر ایک نظر: باب اول میں، جو حضرت علیؓ کے خاندان، پیدائش سے لے کر ہجرت تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے، مصنف نے عرب کے مزاج و امتیازات، قبائل عرب میں قریش اور بنو ہاشم کی خصوصیات اور مناقب پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، پھر اولاد ہاشم میں عبد المطلب پھر ابو طالب اور دین کے لیے ان کی جد و جہد پھر حضرت علیؓ کے برادران کا تعارف پیش کیا گیا ہے، نیز حضرت علیؓ کے اسلام سے لے کر ہجرت تک کے واقعات کو عمدہ ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم حضرت علیؓ کی ہجرت سے لے کر رسول اللہ ﷺ کی وفات تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ باب بہت اہم ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کے جنگی، دینی، علمی اور فقہی

---

[۳] حوالہ سابق، ص ۲۴۔

جواہر کھلے نیز ان کے فضائل و مناقب کے بھی متعدد پہلو سامنے آئے۔ اس باب میں متعدد غزوات و سرایا میں حضرت علیؓ کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ غزوۂ احد میں حضرت علیؓ کی جاں نثاری کے تعلق سے مصنف نے ابن کثیر کے حوالے سے لکھا ہے:

> ابن کثیر کہتے ہیں: حضرت علی غزوہ احد میں موجود تھے۔ لشکر اسلام کا میمنہ سنبھالے ہوئے تھے اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کی شہادت کے بعد عَلَم آپ نے ہی ہاتھ میں لیا اور احد کے موقع میں سخت جنگ کی، لاتعداد مشرکوں کو ٹھکانے لگایا، رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے بہتے ہوئے خون کو دھویا کیوں کہ جب آپ پر دشمن نے وار کیا تو سر مبارک پر زخم آئے تھے اور آگے کے دو دندان مبارک شہید ہو گئے تھے۔ [۴]

مصنف کتاب نے ایک باحث کی امانت اور محقق کی دقت نظری کے ساتھ، حضرت ابو بکرؓ صدیق کی بیعت اور اس سے متعلق خدشات اور اعتراضات کا ازالہ کیا ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ بیعت اجماعی تھی، اور اس کا اشارہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں دے دیا تھا، اور حضرت علیؓ نے بھی بیعت کر لی تھی، ہاں کچھ ناگزیر اسباب کی وجہ سے تاخیر ضرور ہوئی تھی۔

باب سوم باب چہارم اور باب پنجم میں، جو خلفائے ثلاثہؓ کے عہد میں حضرت علیؓ کے حالات و واقعات پر مشتمل ہیں، یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت علیؓ، اس دور میں اسلامی خلافت کے باوقار خادم رہے، انہوں نے اپنی اصابت رائے، بے نظیر فہم و فراست، بے پایاں اخلاص کی برکت سے، اسلامی خلافت کو استحکام بخشا۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ اور حضرت فاطمہ زہراءؓ کے درمیان باغ فدک سے متعلق واقعہ کو مصنف نے بہت ہی خوبصورتی اور احتیاط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا مصنف نے مذکورہ تینوں ابواب میں تینوں خلفاءؓ کے کارنامے، ان کی خدمات اور ان کے انداز ہائے حکومت پر بڑی منصفانہ گفتگو کی ہے اور ان تینوں حضرات کے عہد میں اسلامی فتوحات کا بھی تفصیلی تذکرہ آ گیا ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

باب ششم اور باب ہفتم، جو حضرت علیؓ کے دور خلافت کے احوال پر مشتمل ہیں، ان میں مصنف نے اس دور کے واقعات اور ان کے اثرات کو انتہائی انصاف اور غیر جانبداری سے لکھا ہے۔

مصنف کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی تمام خلافت، خانہ جنگی، شورش و فتنہ پردازی کی نذر رہی۔ آپ سنہ ۳۵ھ میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان ذو النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے

---

[۴] حوالہ سابق، ص ۴۷۔

بعد خلیفہ بنائے گئے اور سنہ ۴۰ھ تک خلیفہ رہے۔ تاریخ اسلامی میں یہ عرصہ انتہائی شورش اور بے اطمینانی کا ہے۔ حضرت علیؓ کو ایک لمحہ بھی سکون نصیب نہیں ہوا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب حضرت علیؓ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو نہ صرف دار الخلافۃ بلکہ تمام عالم اسلام پر آشوب تھا۔ ساتھ میں مختلف قسم کے لوگوں نے اپنے مطالبات رکھے اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ لوگ حضرت عثمان غنیؓ کے قاتلین سے قصاص چاہتے تھے۔ بعض اکابر صحابہؓ آپسی نزاعات سے اپنے کو دور رکھے ہوئے تھے۔ ایک جماعت شیعان علی کی تھی جو حضرت علیؓ کو اپنا مقتدا سمجھتی تھی۔ غرض مختلف اسباب کی وجہ سے حضرت علیؓ کی مسند نشینی کے ساتھ ہی یکایک دنیائے اسلام میں افتراق واختلاف کی آگ بھڑک اٹھی اور شیرازۂ ملی اس طرح بکھر گیا کہ حضرت علیؓ کی سعی اور جدوجہد کے باوجود شیرازہ بندی نہ ہو سکی بلکہ مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس پریشانی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؓ جس زہد و تقوی، دینداری وامانت، عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کرنا چاہتے تھے، اور لوگوں کو دوبارہ جس راستہ پر لانا چاہتے تھے، زمانہ کے تغیر اور حالات کے انقلاب کی وجہ سے اس کے لیے لوگوں کے قلوب میں صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ شیعان علیؓ میں مکمل ہم آہنگی نہیں تھی۔ عبد اللہ بن سبا اور اس کے متبعین نے غلط قسم کے نظریات لوگوں میں رائج کرنا شروع کر دیے جس سے باہمی تصادم اور خانہ جنگی کی آتش بھڑکتی چلی گئی۔

لیکن اس سب کے باوجود حضرت علیؓ نے غیر معمولی ہمت واستقلال اور عدیم النظیر عزم وثبات کے ساتھ آخری لمحۂ حیات تک مشکلات ومصائب کا مقابلہ کرکے دنیا کے سامنے بے نظیر تحمل وسلامت روی کا نمونہ پیش کیا اور کسی بھی سیاسی وغیر سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دیانت داری اور روح شریعت سے سر مو تجاوز کرنا پسند نہ فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں فتوحات کے دائرے کو بہت وسعت نہیں ہوئی؛ بلکہ زیادہ وقت آپسی خانہ جنگیوں کی نذر ہوگیا۔ اس سلسلہ میں جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ خوارج خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

باب ہشتم میں مصنف نے حضرت علیؓ کے حالات وخدمات پر اجمالی نظر ڈالی ہے، جس میں ان کا نظام حکمرانی، ان کا زہد اور خشیت الہی، عام مسلمانوں کے ساتھ ان کا رویہ، امیر معاویہ سے اختلاف اور تنازع کی نوعیت، ان کی زندگی کے دیگر تابناک پہلو نیز ان کی فضیلت میں وارد ہونے والی احادیث کا تفصیلی تذکرہ جامع انداز میں کیا گیا ہے۔

باب نہم جوانان اہل جنت کے سردار حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے تذکرے کے ساتھ

مخصوص ہے۔ اس میں ان کے حالات و کمالات، ان کی خلافت اور خلافت اسلامی کی بازیابی کی کوششیں، نیز یزید کے حالات اور اس کے دور میں ہونے والے واقعات و حادثات جیسے واقعۂ کربلا اور واقعۂ حرّہ وغیرہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

باب دہم کا عنوان مصنف نے "حضرات اہل بیت اور اولاد سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور ان کی پاکیزہ سیرتیں" رکھا ہے۔ اس میں ہر دور میں اہل بیت کے باعزیمت کردار، دین کے لیے ان کی قربانی، ان کا زہد و تقوی، دعوت وارشاد نیز میدان کارزار میں ان کی عہد بہ عہد کوششوں کو مثالوں اور پورے خلوص وجذبہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف رقم طراز ہیں:

> حضرات علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کے اخلاف، اپنے اسلاف کرام کے طریقے پر گامزن ہو گئے۔ پاکیزہ خصائل، پاک نفسی اور عالی ظرفی، وہی عبادت میں انہماک اور آخرت طلبی، اصلاح نفس کی فکر اور دنیا سے بے رغبتی، سچی ربانیت و حقانیت اور خودداری اور کردار کی بلندی (جو رسول کریم علیہ السلام کے خانوادہ کے شایان شان اور پیغمبروں کے حقیقی وارثوں کی علامت تھی) ان حضرات میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ان کا طرز عمل اور پاکبازی اور ان کی سیرتیں اور اخلاق اپنی جگہ پر اعلی دینی مثال و نمونہ اور ایک ایسا اخلاقی دبستان ہے جس سے ہر نسل کے افراد شرافت واخلاق، مروت اور سیر چشمی، بدخواہوں کے ساتھ حسن سلوک اور "بادوستاں تلطف بادشمناں مدارا" کا درس لیتے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے۔ (۵)

اس کے بعد ضمیمۂ اولی میں فرقۂ اثنا عشریہ کے عقیدہ امامت اور ضمیمۂ ثانیہ میں خلفائے اربعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کی قدر وقیمت اہل علم کی نظر میں: المرتضی پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر وصی احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا کی یہ تصنیف ان واقعات، حالات اور ان کے تجزیہ کے بیان پر مشتمل ہے، جو حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ کو اپنی زندگی میں پیش آئے، شہادت کے بعد کے حالات کو بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، تجزیہ انتہائی انصاف اور توازن کے ساتھ حضرت مولانا نے کیا ہے۔ حضرت علی مرتضی کے اعلی مقام کی نشان دہی کے ساتھ اس بیان پر زور ہے کہ کس طرح عقل اور صبر کی مدد سے مخالفت اور سازشوں کا مقابلہ کیا۔ واقعات کو اس طرح لکھا ہے جیسے وہ ہوئے ہیں، ایسے نہیں کہ جیسا ان کو ہونا چاہیے تھا۔ خوب کو خوب تر اور بد کو بدتر دکھانے کی

---

(۵) حوالہ سابق، ص ۳۸۴۔

کوشش نہیں کی ہے۔ سارے فیصلے انصاف سے کیے ہیں اور پڑھنے والوں کے انصاف پر اسے چھوڑا ہے۔ حضرت مولانا نے جس طرح مآخذ کی چھان بین کی ہے، اس سے یہ کتاب خود ایک ماخذ بن گئی ہے، ایک حوالہ کی کتاب۔[۶]

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) المرتضیٰ کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> تمام غیر معتدل نظریات مولانا کے ذہن میں تھے، اس لیے المرتضیٰ کی تصنیف کے دوران انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ان تمام مختلف فیہ موضوعات و مسائل پر جمہور اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق گفتگو کریں، یعنی ایسی گفتگو جس میں تاریخی حقائق کا انکار اور اس سے چشم پوشی بھی نہ ہو، صحابۂ کرامؓ کا احترام بھی ملحوظ ہو اور ان کی طبیعتوں اور رجحانات کا فرق بھی سامنے آجائے۔[۷]

کتاب پر ایک ناقدانہ نگاہ: پہلی بات یہ سامنے رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی انسانی کام، خطا و نسیان سے پاک نہیں ہوسکتا، کتاب کی تعریف میں بڑے بڑے اہل علم و قلم نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے لیکن کچھ حضرات نے کتاب پر نقد بھی کیا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کا بھی تذکرہ ہو۔ جب المرتضیٰ منظر عام پر آئی تو متعدد حضرات نے اس کے مضامین اور مستنبط نتائج پر سوالات کھڑے کیے، جن میں ایک اہم نام مولانا زین العابدین کا ہے، جو جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے ایک تحریر مرتب کرکے مولانا کی خدمت میں ارسال کی تھی لیکن جب مولانا نے توجہ نہ دی تو انہوں نے اسے طبع کرادیا۔ پوری کتاب میری پڑھی ہوئی ہے لیکن افسوس کہ وہ مجھے دوبارہ دستیاب نہیں ہوسکی۔

دوسری تحریر مولانا سید محمد علی حسینی کی ہے۔ موصوف نے اپنی کتاب "دین تصوف و طریقت" میں مولانا ابوالحسن علی کی کتاب المرتضیٰ کے بالخصوص باب دہم کا رد کیا ہے جس میں مولانا نے اہل بیت کے فضائل و مناقب بیان کئے ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ دین کی خدمات کے باب

---

[۶] ندوی، محسن عثمانی: مطالعۂ تصنیفات مفکر اسلام، مقالہ پروفیسر وصی احمد صدیقی، دہلی، عرشی پبلیکیشنز، طبع اول ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۲ - ۱۴۳۔

[۷] حوالہ سابق، مقالہ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، ص ۱۹۴۔

میں جتنا کردار اہل بیت کا ہے، اتنا ہی دیگر صحابہ کی اولاد اور تابعین کا ہے۔[۸]

حاصل یہ ہے کہ المرتضیٰ اپنے موضوع پر ایک جامع اور بہترین کتاب ہے۔ کتاب میں واقعات اور اس کے اثرات کو بہت ہی اعتدال سے لکھا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ اتنے متضاد خیالات جمع ہو گئے ہیں کہ ان کی سوانح پر قلم اٹھانا آسان نہیں تھا مگر مولانا نے اپنی اصابت رائے اور اعتدال فکر و نظر کی بنیاد پر یہ معرکہ بھی سر کرلیا ہے۔ کسی بھی بشری کام کو اسی کے دائرے میں دیکھنا چاہیے۔ مولانا کے تمام تر تجزیات و تحقیقات سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور یہی نقطۂ نظر تمام اصحاب فکر و نظر کے تئیں قائم ہونا چاہیے۔

---

(۸) حسینی، سید محمد علی: دین تصوف و طریقت (حیدر آباد، آندھرا پردیش، الاوراق پبلشرز اینڈ بک سیلرز۔ ۲۴۵۷۔ ۱۷، کرما گوڑہ، سعید آباد، سن اشاعت ۲۰۰۳)، ص ۲۰۱۔

تلمیذ شبلی

مسعود علی محوی کی فارسی خدمات

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

azmi408@gmail.com

سر سید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کے ولولۂ تعلیمی کی پہلی کامیابی ایم اے او کالج علی گڑھ کی پہلی جماعت کے طلبہ تھے جو کامیاب ہو کر نکلے۔ان میں بعضوں نے بڑی عزت و عظمت اور شہرت و مقبولیت پائی اور بڑے بڑے عہدہ و مناصب تک پہنچے۔ان فضلا میں ایک اہم نام مولوی مسعود علی محویؔ (۱۸۶۱- ۱۹۵۳ء) سابق سیشن جج عدالت عالیہ حکومت حیدر آباد دکن کا بھی ہے۔وہ ۲۸/ اکتوبر ۱۸۶۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے جد امجد مولانا مخدوم بخش بخششؔ اور والد ماجد مولوی احمد علی احمدؔ تھے۔یہ دونوں بزرگ اپنے عہد کے دہلی کے ممتاز اشخاص میں تھے۔مولانا مخدوم بخش بخششؔ کا مزار خواجہ باقی باللہ (۹۷۱- ۱۰۱۲ء) کی درگاہ کے جنوبی دروازے کے سامنے واقع ہے، جبکہ ان کے والد کا مزار حضرت نظام الدین اولیاؒ (۱۲۳۸- ۱۳۲۵ء) کی درگاہ کے اندر اور امیر خسرو (۱۲۵۳- ۱۳۲۵ء) کے مزار کے سامنے کے چبوترے پر ہے۔

مولوی مسعود علی محوی کا آبائی وطن قصبہ فتح پور (بسواں) ضلع بارہ بنکی تھا۔والد کی وفات کے بعد یہ ایک عرصے تک اپنے چچا مولوی علی احمد کی کفالت میں دہلی میں رہے۔وہ جب اپنی ملازمت کے سلسلے میں ضلع رہتک چلے گئے تو یہ خاندان اپنے آبائی وطن فتح پور (بسواں) چلا گیا۔ محوی ۱۶/ سال کی عمر تک وہیں پلے بڑھے۔اور ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور تقریباً گیارہ بارہ برس تحصیل علم کے بعد سنہ ۱۸۸۹ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔یہیں انہیں علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل ہوا اور ان سے فارسی زبان وادب کی تحصیل و تکمیل کی۔وہ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فارسی میں داد سخن دینے لگے۔وہ جس وقت علی گڑھ کالج میں بی اے کے طالب علم تھے علامہ شبلی اس وقت وہاں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔علاوہ ازیں وہ کالج میں کلاسز کے آغاز سے پہلے درس قرآن دیا کرتے تھے۔اس میں وہ قرآنی

آیات کی آسان زبان میں اس طرح تفسیر و تشریح کرتے تھے کہ بچوں کے ذہن نشین ہو جائے۔ اس میں وہ فارسی اشعار سے بھی کام لیا کرتے تھے۔ اس درس قرآن میں کالج کے طلبہ شریک ہوا کرتے تھے۔ علامہ کے درس قرآن سے مستفید ہونے کا ذکر ان کے متعدد تلامذہ نے کیا ہے۔

تکمیل کے بعد مولوی مسعود علی محوی فروری ۱۸۹۰ء میں دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کی طلب پر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں ملازمت اختیار کی اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اس میں سب سے اعلیٰ عہدہ جس پر وہ عرصۂ دراز تک فائز رہے وہ عدالت عالیہ میں سیشن جج کا منصب تھا۔ اپنے عہدوں کی منصبی مصروفیات کے باوجود مسعود علی محوی نے علم و ادب اور شعر و شاعری سے گہرا شغف رکھا اور داد سخن دینے کے علاوہ متنوع علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔ تقریباً پچاس برس تک ملازمت کے بعد وہ سبکدوش ہوئے اور حیدرآباد میں ہی بود و باش اختیار کی۔ ۱۹؍ جنوری ۱۹۵۳ء کو حیدرآباد دکن میں فارسی شعر و ادب کے اس بڑے خدمت گذار نے وفات پائی۔ تکیہ موسیٰ شاہ قادری، باغ مرلی دھر، معظم جاہی روڈ حیدرآباد دکن میں مدفون ہیں۔[1]

مولوی مسعود علی محوی نے فارسی زبان و ادب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ نہ صرف اس کی ادبی تاریخ اور عہد بہ عہد ارتقا پر عالمانہ نگاہ رکھتے تھے بلکہ اس کے لکھنے پر بھی انہیں دسترس اور عبور حاصل تھا۔ ان کی متعدد فارسی تحریریں اور تبصرے ناچیز کی نظر سے گذرے ہیں۔ انہوں نے فارسی کی جو کتابیں لکھیں یا مرتب کیں ان کی تفصیلات یہ ہیں:

عناصر اربعہ: رباعی: یہ دراصل ایک خطبہ ہے جو مولوی مسعود علی محوی نے ۲۱؍ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ ؍ ۱۹۲۷ء کو انجمن علمی فارسی شعبہ جامعہ معارف ایران حیدرآباد دکن کے ایک اجلاس میں دیا تھا۔ اس میں انہوں نے صنف رباعی کے سبب اختراع، تعریف و امثال و اوزان، اس کے چار عناصر اور نمونوں پر بحث و تحقیق پیش کی ہے۔ مذکورہ چار امور کے ذیل میں متعدد ذیلی عناوین بھی قائم کئے ہیں۔ چند نامور رباعی گو شعرا ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام اور سحابی استر آبادی کے تذکرے کے ساتھ ان کی رباعی گوئی، اس کے اقسام اور فنی خصوصیات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سے فارسی رباعی گوئی کی تاریخ کا ایک مرقع سامنے آجاتا ہے۔ فارسی میں لکھی گئی یہ کتاب جہاں اصناف سخن بالخصوص رباعی گوئی پر مولوی مسعود علی محوی کی گہری نظر کی شاہد ہے وہیں فارسی لکھنے میں ان کی قدرت کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ آخری صفحہ پر یہ صراحت ہے:

---

[1] مجموعہ کلام اردو حضرت مسعود علی محوی، ناشر: رفعت محمود صدیقی، گلشن اقبال کراچی، جنوری ۲۰۰۳ء، ص: ز، ط

ایں کتاب بہ اعضاء جامعہ معارف در ایران و ہندوستان ہدیہ دادہ می شود و بہ غیر اعضاء بقیمت شش آنہ در ہند و یک قران و نیم در ایران فروختہ می شود محل فروش آں در حیدرآباد نزد آقا سید محمد علی پروفسور نظام کالج و در ایران طہران خیابان لالہ زار کتاب خانہ طہران۔

سفینہ شیخ علی حزیں: ''سفینہ'' شیخ علی حزیں لاہجی(۱۶۹۲- ۱۷۶۵ء) کے متفرق اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ نادر مجموعۂ اشعار مولوی مسعود علی محوی کے پاس ایک تاجر کتب برائے فروخت لایا تو انہوں نے اہمیت کے پیش نظر اس کا ذکر مہاراجہ سرکشن پرشاد(۱۸۶۴- ۱۹۴۰ء) وزیر اعظم حکومت حیدرآباد دکن سے کیا، چنانچہ انہوں نے منہ مانگی قیمت پر اسے خرید کر افادۂ عام کے خیال سے شائع کرنے کی ذمہ داری مولوی مسعود علی محوی کو سونپی اور طباعت کے اخراجات اپنے ذمہ لئے اور اس پر مختصر سا دیباچہ بھی لکھا جو اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس سے مہاراجہ کی علم دوستی اور ادب پروری کے ساتھ ان کے شعر و ادب سے گہرے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔

''سفینہ'' کے اس نسخہ کو مولوی مسعود علی محوی نے ۱۹۳۰ء میں دارالطبع حیدرآباد دکن سے طبع کرایا اور اس میں ''شیخ علی حزیں کے مختصر حالات زندگی'' بھی اردو میں لکھ کر شامل کر دیئے، نیز ان کی شاعری پر نقد و تبصرہ بھی کیا۔ علاوہ ازیں ایک تمہید بھی لکھی جس میں مذکورہ بالا تفصیلات کے ساتھ نوادر کی اہمیت اور انتخابات کی افادیت پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ نوادر کی اہمیت مولوی مسعود علی محوی کو اپنے استاد علامہ شبلی سے ورثے میں ملی تھی۔ اس سلسلے میں ''سفینہ'' کی تمہید میں انہوں نے اپنے استاد علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> جس طرح اہل یورپ نے ہمارے ملکوں، ہماری حکومتوں اور ہماری دولتوں پر قبضہ کر لیا ہے اسی طرح وہ ہمارے علمی اور ادبی ذخیروں کے بھی مالک اور قابض ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کا کوئی چھوٹا بڑا شہر ایسا نہیں ہے جس کے علمی اور ادبی نفائس اور نوادر چن چن کر یورپ کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں نہ پہنچ گئے ہوں۔ یہ بطور شکایت کے نہیں بلکہ بطور حکایت کے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ذخیروں میں سے جو کچھ ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے اس کے رکھ رکھاؤ اور اس سے استفادہ کی قابلیت بھی ہم سے مفقود ہو گئی ہے۔ برخلاف اس کے جو چیزیں یورپ پہنچ گئی ہیں وہ محفوظ ہیں اور ان سے استفادہ کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے ہمارے خیال میں یہ بدقسمتی زیادہ تأسف کے قابل نہیں ہے۔ ہندوستان کے انہیں باقی ماندہ ذخیروں سے بعض اوقات کچھ جواہر پارے نکل آتے ہیں اور اگر خوش نصیبی سے ایسے لوگوں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں جو ان کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں تو وہ روشنی میں آکر زمانہ کی

دست برد سے بچ جاتے ہیں۔کسے معلوم تھا اور کون جانتا تھا کہ میرزا صائب نے قدیم اساتذہ کے کلام کا ایک لاجواب انتخاب کیا ہے۔ اتفاقاً ایک دوست کے پاس میں نے اسے دیکھا اور ان سے مستعار لا کر اپنے استاد مولانا شبلی مرحوم کو دیا۔ مولانا مرحوم اسے دیکھ کر جس قدر خوش ہوئے اور جس قدر اس کی قدر کی اس کا اندازہ کرنا ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے بچشم خود یہ منظر نہیں دیکھا نہایت مشکل ہے۔ مولانا مرحوم حیدرآباد سے کوئی بڑی تنخواہ نہیں پاتے تھے، لیکن باوجود اس کے اس پر آمادہ تھے کہ اگر مالک کتاب اس مجموعہ کے معاوضہ میں المضاعف وزن میں چاندی لینا چاہے تو وہ بخوشی دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نسخہ نہایت خوش خط اور جابجا مذہّب تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاہی یا کسی امیر کے کتب خانہ کے لئے نہایت اہتمام سے لکھوایا گیا ہے۔ غرض مولانا مرحوم کی تعریف اور قدردانی کی شہرت نے حیدرآباد میں اس مجموعہ کی دھوم مچادی اور ہر ایسے شخص نے جس کے پاس بڑا کتب خانہ تھا اپنے کتب خانہ میں اس کی تلاش شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ کے کتب خانہ سے بھی اس کا ایک نسخہ برآمد ہوا اور بعض دوسرے لوگوں کے پاس بھی اس کا پتہ چلا۔ اور یہ مردہ تالیف از سر نو زندہ ہوگئی۔ شیخ علی حزیں کے اس سفینہ کی بھی تقریباً یہی کیفیت ہے۔[۲]

مسعود علی محوی کا خیال ہے کہ مجموعہ کلام اور دواوین کی اہمیت اپنی جگہ لیکن انتخابات کی بھی کچھ کم اہمیت نہیں ہوتی۔ انہوں نے چند مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ تاریخ ادب میں بعض دفعہ اصل کلیات سے زیادہ انتخابات نے شہرت و مقبولیت پائی اور شعر و ادب کے مذاق کے فروغ میں انتخابات نے نہایت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے مثال میں ''خریطۂ جواہر'' کو پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ دہلی و لکھنؤ کی شاعری میں جو بنیادی فرق واقع ہوا وہ اسی انتخاب ''خریطۂ جواہر'' کی مقبولیت کی بنا پر واقع ہوا۔ ان ادبی مباحث سے مولوی مسعود علی محوی کی فارسی شاعری پر گہری اور ناقدانہ نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دیوان حسن سجزی دہلوی: سفینہ حزیں کے بعد مولوی مسعود علی محوی نے امیر حسن سجزی دہلوی (۶۵۳-۷۳۸ھ) کا دیوان مرتب کر کے شائع کرایا۔ یہ ادبی و تحقیقی کام بھی انہوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ وزیر اعظم حکومت حیدرآباد دکن ہی کی ایما پر انجام دیا۔ یہ ۱۳۵۲ھ /۱۹۳۳ء میں مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن میں طبع ہوا ہے۔ اس میں بھی وزیر اعظم مرحوم

---

[۲] سفینہ، شیخ علی حزیں، مرتبہ: مسعود علی محوی، مطبع جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۰ء، ص: الف۔ج

سر کشن پرشاد کی تمہید شامل ہے۔ جس میں انہوں نے دیوان حسن سجزی کے اسباب اشاعت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> حضرت امیر حسن سجزی علیہ الرحمہ سے عقیدت اور ارادت مندی کے چند در چند سلسلے موجود ہیں۔ ان کا گراں مایہ اور بلند پایہ تصوف، ان کی دلکش اور درد انگیز شاعری، ان کا دکن کا توطن اور مدفن ان سب تعلقات نے مل جل کر ان کی ذات مجمع الصفات اور ان کے کلام بلاغت نظام سے ایک خاص انس اور ربط پیدا کر دیا ہے۔ ان کے دیوان جو امتداد زمانہ سے روز بروز کم یاب ہوتے جاتے ہیں، ذاتی کتب خانہ کے علاوہ دوست احباب کے کتب خانوں سے عاریۃً منگائے اور بعض نسخے خرید کر معائنہ کیے، مختلف نسخوں کو دیکھنے اور مقابلہ کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ سب ایک دوسرے سے مختلف اور ناتمام ہیں۔ اب تک کوئی ایسا نسخہ نظر سے نہیں گذرا جو ان کے تمام موجودہ کلام پر حاوی ہو۔ علاوہ اس کے جتنے نسخے دیکھے گئے ان میں سے اکثر چند روز کے مہمان نظر آئے۔ بعضوں کی سیاہی اڑ رہی ہے، بعضوں کے کاغذ جواب دے رہے ہیں اور بعضوں کو کیڑے کھا رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر خیال آیا کہ اگر چند روز ان پر اسی طرح اور گذرے تو حضرت امیر حسن سجزی علیہ الرحمہ کی تمام عمر کی جگر کاوی برباد ہو جائے گی، اور ہندوستان کے ایک نام آور شاعر کا کلام صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ اس خیال سے بے چین اور اس پر آمادہ کر دیا کہ جس طرح بن پڑے ان کا متفرق کلام جہاں تک دستیاب ہو سکے ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیا جائے تاکہ وہ ایک مزید مدت تک کے لئے غارت گر زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔ اس کے لئے مصارف اور تلاش و تالیف کی ضرورت تھی۔ اس کا پہلا جز اس خادم الشعرا کے ذمے رہا۔ اور دوسرا جز مولوی مسعود علی محوی بی اے (علیگ) سابق سشن جج سرکار عالی نے جو فقیر شادؔ کے مخلص محبان قدیم سے ہیں براہ علم دوستی اپنے ذمے لیا۔ بحمد اللہ دوڈھائی سال کی لگاتار محنت کے بعد یہ کلیات موجودہ شکل میں مرتب ہو کر چھپ گیا ہے اور ان علمی یادگاروں میں سے ایک یادگار ہے جو ہمارے آقائے ولی نعمت اعلیٰ حضرت قدر قدرت نواب میر عثمان علی خاں ادام اللہ سلطانہ کی مسیحائی سے از سر نو زندہ ہو رہی ہیں۔

سر کشن پرشاد شادؔ کے مذکورہ بیان سے اندازہ ہوا کہ دیوان امیر حسن سجزی کی تالیف و تدوین میں مولوی مسعود علی محوی تقریباً دوڈھائی سال مسلسل مصروف رہے اور تحقیق و تدقیق کرتے رہے۔

وزیر اعظم حیدر آباد کی تمہید کے بعد مولوی مسعود علی محوی کا ایک مقالہ ”امیر حسن اور ان کا زمانہ“ کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ مقالہ ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے اور انتہائی تلاش و تفحص اور تحقیق و تدقیق سے لکھا گیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ امیر حسن سجزی کے حالات اور ان کا عہد مجسم ہو کر

سامنے آگیا ہے۔اس میں مقالہ نگار مولوی مسعود علی محوی کی خوب صورت اور سادہ وسلیس اور شگفتہ نثر کے نمونے متاثر کرتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> جس طرح ضیائے آفتاب میں ستاروں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اسی طرح نام آور شاعروں کے سامنے گم نام شاعر چندروز میں بے پتا ہو جاتے ہیں۔اگرچہ منشی غلام حسین مرحوم ومغفور شاعری کے آسمان پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکنے کے مستحق تھے مگر امیر حسن کی نام آوری کے آفتاب نے انہیں چمکنے نہ دیا اور جو کچھ ان کی بضاعت بازار شہرت میں آئی، وہ سب امیر حسن کے نام سے بکی۔ بعینہ یہی حال ان لوگوں کے کلام کا ہوا جنہوں نے سعدی اور حافظ سے مشہور استادوں کے تخلصوں پر دست درازی کی تھی۔ [۳]

اس کے بعد مرتب کے قلم سے ضمیمہ ودیباچہ ہے۔اس میں دیوان امیر حسن سجزی کی تدوین کے مختلف مراحل کا ذکر ہے۔ مختلف دواوین کی جمع آوری، مطالعہ وتحقیق اوراغلاط وتکرار کلام کی نشاندہی، پھر ان کا انتخاب، ایک مکمل نسخہ دیوان کی ترتیب، کتابت وطباعت، پروف خوانی وغیرہ ایک ایک پہلو کا دیباچہ نگار نے ذکر کیا ہے۔اوران تمام تحقیقی کاوشوں اور محنتوں کا ذکر کیا ہے جو اس دیوان کے لئے اٹھائی گئی ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ایک دیوان کو مرتب ومدون کرنے میں جن تحقیقی اصولوں سے کام لیا جاسکتا تھا مرتب نے اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

دیوان میں اولاً امیر حسن سجزی دہلوی کی غزلیات ہیں پھر رباعیات ومتفرقات شامل ہیں۔ بعد ازاں قصائد ومثنویات فارسی درج ہیں۔ ۷۵۰ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم "دیوان حسن سجزی دہلوی" مولوی مسعود علی محوی نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔اس کی ترتیب واشاعت فارسی زبان وادب بالخصوص دکن میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔

مولوی مسعود علی محوی فارسی زبان کے شائق ودلدادہ اور اس کے بڑے اداشناس تھے۔ نہ صرف نثر نگار تھے بلکہ نہایت عمدہ اور پختہ مشق شاعر وسخن سنج بھی تھے۔ مشہور شاعر اور قصیدہ گو قاآنی (۱۸۰۸- ۱۸۵۴ء) کے طرز میں شاعری کرتے اور قصیدے کہتے تھے۔ چونکہ یہ سلسلہ عہد طالب علمی میں صحبت شبلی میں قائم ہوا تھا، چنانچہ اس کے لئے وہ معروف تھے۔ان کی شاعری کا آغاز دور طالب علمی میں ہوا اور پھر تاحیات داد سخن دیتے رہے۔ طالب علمی اور پھر دوران ملازمت بھی تمام تر مصروفیات کے باوجود سلسلہ شاعری وسخنوری قائم رہا۔افسوس ان دونوں

---

[۳] دیوان حسن سجزی، مرتبہ مولوی مسعود علی محوی، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۲ھ، ص:۹۶

ادوار کا ان کا تمام کلام ان کے زمانہ قیام لکھنو میں چوری ہو گیا۔ اس حادثہ پر وہ تڑپ کر رہ گئے۔ جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے انہوں نے یہ شعر بھی لکھا ہے کہ:

عمر در شعر بسر کردہ و درباختہ ام
عمر درباختہ را بارِ دگر باختہ ام

نذر عقیدت: یہ مولوی مسعود علی محوی کے فارسی قصائد کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ اوپر گذرا، انہیں قصیدہ گوئی میں خاص مہارت حاصل تھی، جس کی داد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۷-۱۹۵۰ء) اور مولوی عبد اللہ العمادی (م: ۲۸ ر اگست ۱۹۴۷ء) نے دی ہے۔ اسے خود انہوں نے ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) میں شائع کرایا۔ اس میں ان کے غالباً تمام دستیاب قصائد آ گئے ہیں۔ بیشتر قصائد امراء وشاہان حیدرآباد دکن کی شان میں کہے گئے ہیں۔ حاشیہ میں اپنے متعدد قصائد کے لکھنے کے اسباب کی وضاحت کی گئی ہے اور منظومات و قصائد جن کے لئے کہے گئے ہیں یا ان میں جن واقعات کی طرف اشارہ ہے جا بجا ان کا حاشیوں میں ذکر ہے۔ مثلاً دیوان کے پہلے قصیدہ کا آخری شعر ہے کہ:

بہ مثل گر تو کلیمی بہ سخن آرائی
شاہ را ہم بعطا شاہ جہاں خواہی دید

اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

کلیم ہمدانی عہد شاہ جہانی کا ملک الشعرا تھا۔ ایک سال نوروز اور عید شوال ایک ہی دن واقع ہوئی۔ اسی دن بادشاہ نے کشمیر کے سفر سے واپس آ کر تخت طاؤس پر جلوس فرمایا تھا۔ اس موقع پر کلیم نے ایک قصیدہ سنایا جس کا مطلع یہ ہے:

خجستہ مقدم نو روز و غرۂ شوال
فشاندہ اند چہ گلہائے عیش برسر سال

شاہ جہاں نے قصیدہ سن کر حکم دیا کہ کلیم چاندی میں تول دیا جائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیم بہت دبلا پتلا آدمی تھا۔ ساڑھے پانچ ہزار روپئے سے زیادہ نہ لے سکا۔ یہ دینے کا طریقہ تھا جس سے یہ قصہ آج تک مشہور چلا آتا ہے۔ ورنہ دور کیوں جایئے، خاندان آصفیہ کے فرماں رواؤں نے اس سے بہت زیادہ مقدار میں شعرا کو انعام دیے ہیں۔ حضرت غفران مکان (میر محبوب علی خاں مرحوم و مغفور) نے داغ مرحوم کو یکمشت اسی ہزار روپئے عنایت فرمائے۔[۴]

یہ اور اس نوع کے پچاسوں حواشی دیباچہ نگار نے لکھے ہیں۔ حتیٰ کے قصیدوں کی بحر اور زمین کا بھی جا بجا ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ بحر یا یہ زمین کس بادشاہ یا امیر و وزیر نے پیش کر کے

---

[۴] نذر عقیدت، قصائد محوی، مولوی مسعود علی محوی، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، ۱۳۵۶ھ، ص: ۵

قصیدہ کی فرمائش کی تھی۔

یہ قصائد علی العموم قصائد ہی ہیں مگر کہیں کہیں حالات اور زمانے کا پرتو بھی آ گیا ہے۔ مبالغہ قصائد کی جان ہیں اور شاعر نے بھی اس سے کام لیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں حقیقت بیانی سے بھی قصیدے میں جان ڈالی ہے۔ بحیثیت مجموعی محوی کے قصیدے اپنے عہد کے بہترین قصیدے بلکہ قصیدہ نگاری کے نمونے کہے جاسکتے ہیں۔

"نذر عقیدت" کے دیباچہ میں مولوی محوی نے اپنے استاذ علامہ شبلی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے، جس سے علامہ شبلی کے علی گڑھ کالج کے اس ابتدائی زمانہ کے طریقۂ درس و تدریس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں شعر و ادب کا حقیقی ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> کہتے ہیں کہ فارسی شاعری کی ابتدا قصیدہ سے ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی نظم نویسی اسی صنف شعر سے شروع کی۔ علی گڑھ کالج کی بی اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد داخل تھے۔ مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے۔ مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دینے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کر دینے میں ملکہ رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم و مغفور کی دلچسپ اور مؤثر صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا۔ کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے بالکل پاک اور صاف ہو گئے اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہو سکا۔[۵]

خدا جانے علامہ شبلی نعمانی اپنے تلامذہ میں کون سا جذبہ ابھار دیتے تھے کہ وہ انہیں کبھی فراموش نہیں کر پاتے تھے۔ سچ ہے کوئی کسی کا یونہی قدرداں نہیں ہوتا، اس کے لئے جوہری ہونا بھی ضروری ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ علامہ شبلی اپنے عہد کے شاید سب سے بڑے جوہری تھے۔ نخاس لکھنو میں پنساری کی دوکان سے مونس الارواح کا وہ نسخہ جسے آج دارالمصنّفین میں دکھا دکھا کر ہم اپنی عزت بڑھاتے ہیں، وہ نوادر کے اسی جوہری کے ذوق علم ادب کا آئینہ دار ہے۔

دیوان محوی:

سنہ ۱۹۴۷ء میں ان کا دوسرا مجموعہ "دیوان محوی" کے نام سے سجاد پریس حیدر آباد دکن سے

---

[۵] نذر عقیدت، مولوی مسعود علی محوی، شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، ۱۳۵۶ھ، ص: د

شائع ہوا۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے لکھا ہے:

پارسل دیدہ افروز ہوا، کھولا دیکھا۔ آنکھیں پرنور دل مسرور ہوا۔ 'نذر عقیدت' قند مکرر ہے۔ پہلا نسخہ کتاب خانہ سے نکال کر دیکھا۔ دیوان محوی تازہ بہار ہے۔ پہلے جو کمی رہی تھی وہ پوری ہوئی۔ کلام پڑھا دیکھا۔ بلامبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ پایہ بلند ہے، معیار عالی، پاکیزگی کلام دور گذشتہ کے فصحا کی یاد دلاتی ہے۔ حال کے معیار سے بلند ہے بلکہ تعجب انگیز ہے۔ اس دور میں یہ پاکیزگی و بلندیِ ذوق حیرت فزا ہے۔

بڑی مسرت اس کی ہے کہ اس دور بدمذاقی میں آنکھیں فارسی کلام کے نور سے منور ہوئیں۔

اے وقت تو خوش کہ وقت من خوش کردی۔

"نذر عقیدت" کے مقدمے میں، میں نے لکھا تھا "ابھی یہ چنگاریاں باقی ہیں، کیا عجب کہ کسی روز بھڑک اٹھیں۔ دلوں کو گرما دیں۔ شکر ہے یہ توقع "دیوان محوی" کی اشاعت سے پوری ہوئی"[۶]

اس کے مرتب اگرچہ محوی مرحوم کے منجھلے بیٹے رشید احمد ایم اے ایل ایل بی (علیگ) ہیں تاہم دیباچہ خود شاعر مسعود علی محوی نے لکھا ہے۔ اس میں بھی انہوں نے ایک بار پھر اپنے استاد علامہ شبلی کی جلالت علمی کو یاد کیا ہے اور ان کے صحیح مذاق فارسیت کا خاص طور پر اعتراف کیا ہے۔[۷]

دیوان محوی کے آغاز میں سید محمد علی مؤلف فرہنگ نظام واستاد سابق نظام کالج کی تقریظ شامل ہے، جس میں انہوں نے شاعر کی تخلیقی اٹھان کی داد دی ہے اور خاص طور پر ان کی غزل گوئی کو سراہا ہے۔ ان کے بعد مولوی مسعود علی محوی نے فہرست درج کی ہے، چونکہ یہ غزلوں کا مجموعہ ہے اس لئے فہرست میں ان غزلوں کی نشاندہی کی ہے اوران کے اندراج نمبر درج کئے ہیں جن غزلوں میں حمد باری تعالیٰ یانعت نبویؐ یا دیگر موضوعات مثلاً منقبت، قصائد، مراثی اور تواریخ کا ذکر ہے۔ یہ اپنے نوع کی ایک الگ فہرست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعرا کو اس نوع کی فہارس اپنے مجموعۂ کلام میں ضرور درج کرنی چاہئے۔ اس سے ان کے کلام کی تفہیم میں آسانی ہو گی۔

مجموعہ کلام اردو:

مجموعہ کلام اردو مولوی مسعود علی محوی مرحوم کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ اسے ان کے بڑے صاحبزادے حبیب احمد صدیقی نے مرتب کیا ہے اور رفعت محمود صدیقی کے زیر اہتمام جنوری

---

[۶] دیوان محوی، مولوی مسعود علی محوی، مرتبہ: رشید احمد، مطبوعہ سجاد پریس، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۷ء، ص ۵۔۶

[۷] دیوان محوی، ص: ۶

۲۰۰۳ء میں گلشن اقبال کراچی سے شائع ہوا ہے۔

مولوی صاحب مرحوم نے ابتدا سے فارسی میں شاعری کی اور وفات سے چند سال پہلے تک وہ فارسی ہی میں داد سخن دیتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> مجھے شاعری کا شوق بچپن سے تھا مگر اردو کی طرف اس زمانے کے رنگ شاعری نے متوجہ نہ ہونے دیا اور چونکہ خود اردو شاعری نے موجودہ روش اختیار نہیں کی تھی اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ کہا وہ بیشتر فارسی ہی میں کہا اور اس میں ایک قسم کی مہارت ہو گئی۔ اس کو چھوڑ کر اردو کے نئے رنگ میں مبتدی بننے کو جی نہ چاہا۔[۸]

سقوط حیدرآباد کے بعد محوی فارسی کے بجائے اردو میں شعر کہنے لگے۔ اردو میں ان کا بیشتر کلام اصلاً سقوط حیدرآباد کا مرثیہ ہے۔ بعض غزلیں اس کے علاوہ بھی ہیں اور بڑی پختہ اور تغزل سے بھرپور ہیں تاہم وہ بھی مرثیہ سقوط حیدرآباد سے خالی نہیں ہیں۔ اور ایسا کیوں کر نہیں ہوتا، جس شخص نے پچاس برس سے زائد مدت تک حکومت حیدرآباد سے وابستگی میں گذارے ہوں اور پھر ایک دم سے وہ حکومت ہی نہیں رہی تو اس کا ردّ عمل فطری تھا۔ دو تضمین، ایک غزل کے چند اشعار اور ایک نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ملک دکن کی ذلت و خواری کو دیکھ کر
"دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے"
اس سانحہ کا حال سنو بھر کے ایک آہ
"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

۱۹۴۸ء

عنان سلطنت دی ہے خدا نے ایسے ہاتھوں میں
جنہیں رخش حکومت کی نہیں معلوم جولانی
بسر کی ہو جنہوں نے زندگی صدیوں غلامی میں
وہ کیا جانیں جہاں گیری وہ کیا جانیں جہاں بانی
عبث ہے ان سے امید رعایا پروری کرنا
یہ بھوکے بھیڑیے اور ان سے بھیڑوں کی نگہبانی

---

[۸] مجموعہ کلام اردو، ص:ب، مولوی مسعود علی محوی، مرتبہ: حبیب احمد صدیقی، گلشن اقبال کراچی، ۲۰۰۳ء

نہ جانیں یہ عدالت کو نہ یہ واقف ضرورت سے
نہ ان کے درد ہے دل میں نہ ان کی آنکھ میں پانی
وہی ہیں کار فرما آج کل قصر حکومت میں
بڑی عزت سمجھتے تھے جو اس کے در کی دربانی
بےکس دکن، غریب دکن، بےنوا دکن
کس کی نظر لگی تجھے اے خوش نما دکن
کیوں ہو گیا تو رنج میں یوں مبتلا دکن
لایا ہے کون سر پہ ترے یہ بلا دکن
بگڑی تری جہاں میں یہ کیسے ہوا دکن
بےکس دکن، غریب دکن، بےنوا دکن
تیرے وفاق و ربط و محبت کو کیا ہوا
مشہور خلق و مہر و مروت کو کیا ہوا
ان سب کو چھوڑ تیری حمیت کو کیا ہوا
اے راہ و رسم مہر سے نا آشنا دکن
بے کس دکن، غریب دکن، بے نوا دکن[۹]

مولوی مسعود علی محوی کو دنیا ایک جج اور شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے، مصنف اور مترجم کی حیثیت سے نہیں جانتی۔ حالانکہ انہوں نے مذکورہ بالا کاوشوں کے علاوہ کوکبۂ حمیدیہ، اصول واقعات متعلقہ، مشیر الوکلاء، اصول فقہ اسلام (مؤلف جسٹس سر عبدالرحیم)، قانون بین الاقوام (مولفہ ویسٹ لیک)، قانون قدیم (مؤلفہ مین)، آئین انگلستان (مؤلفہ ڈائسی)، شرع اسلام (مؤلفہ ملّا فریدون)، حالات اقوام جرائم پیشہ ممالک محروسہ سرکار عالی، دستورالعمل کوتوالی، وکالت، مخدوم زادگان فتح پور (حصہ اول و دوم) رہنمائے مدینہ اور حیدرآباد جیسی کتابیں لکھیں اور ترجمہ کیں۔ یہ مطبوعہ کتابیں کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ علاوہ ازیں بعض غیر مطبوعہ کتابیں بھی ان کے ذخیرۂ علمی میں ملی تھیں۔[۱۰] خدا جانے اب وہ کہیں محفوظ بھی ہیں یا نہیں، لیکن مسعود علی محوی کی فارسی زبان و ادب کی مذکورہ خدمات انہیں تاریخ ادبیات میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

---

[۹] مجموعہ کلام اردو حضرت مسعود علی محوی، گلشن اقبال کراچی ۲۰۰۳ء، ص:۴

[۱۰] مجموعہ کلام حضرت مسعود علی محوی، ص: ز، ط

اخبار علمیہ

فلسطین میں ۱۹۰۰؍سال پرانی تحریر برآمد

فلسطین میں بردی(papyrus) پر لکھی ہوئی ایک تحریر رومن زمانے کے کچھ کورٹ قضیوں کے بارے میں سنہ ۲۰۱۴ میں ملی تھی۔ اب اس تحریر کو پڑھ لیا گیا ہے۔ یہ تحریر نبطی رسم الخط میں ہے جو عربی رسم الخط کی ماں ہے۔ عبرانی یونیورسٹی کی بردی اکسپرٹ حنّا کاٹن نے اس کا ترجمہ ۲۸؍جنوری کو ٹائخ جرنل (Tyche) میں شائع کر دیا ہے۔ یہ ایک سرکاری وکیل کے نوٹ ہیں جو اس نے غلاموں کے خرید و فروخت کے کسی مقدمے کے سلسلے میں رومی شہنشاہ ہادریان (دور حکومت: ۱۱۷-۱۳۸ء) کے دور میں لکھے تھے(لائیو سائنس ڈاٹ کام،۲۹؍جنوری ۲۰۲۵)۔(ظ-ا-خ)

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

جنوبی افریقہ کے ایک سائنسی ٹیلکوپ نے انکشاف کیا ہے کہ ہماری کائنات میں نظام شمسی سے بھی ۳۲ گنا بڑا ایک اور نظام موجود ہے۔ اس دوسرے نظام کا رقبہ ۳ء۳ ملین روشنی کے سال کے برابر ہے۔ اس نئے نظام کا نام اِنکانتھازو Inkanthazo رکھا گیا ہے۔ یہ انکشاف جنوبی افریقہ کے جدید ترین طاقتور ٹیلکوپ میر کیٹ MeerKAT کے ذریعے کیا گیا ہے۔ اس نئے انکشاف سے کائنات کے بارے میں پرانے نظریات ڈھ گئے ہیں۔ اتنے وسیع ترین رقبے پر پھیلے ہوئے نظام کے بننے اور توسع کی موجودہ سائنسی نظریات کے تحت توجیہ نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ نیا نظام دوسرے بہت سے نظاموں کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ اس انکشاف سے کائنات کی تکوین کے رازہائے سربستہ کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس طرح سے پھیل رہی ہے۔ اس انکشاف کے بعد امید ہے کہ کائنات کے اسرار سے مزید پردہ اٹھے گا۔ (انڈین ڈیفنس ریویو ڈاٹ کام- ۲۷ جنوری ۲۰۲۵)

(ظ۔ا۔خ)

علی گڑھ میں دوروزہ قومی سیمینار کا انعقاد

"غیر فطری جنسی اعمال: قرآن وسنت اور عملی احکام کی روشنی میں" کے موضوع پر دوروزہ قومی سیمینار ۱۷۔۱۸/ فروری ۲۰۲۵ء کو خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی اور نظامت ڈاکٹر محمد ایوب اکرم نے کی۔ ادارہ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا، جس میں انہوں نے کہا کہ مغرب کی خدا بیزار تہذیب نے انسانی معاشرے کو "غیر فطری جنسی اعمال" جیسے مہلک اور مخرب اخلاق فتنے میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہم جنس پرستی کے علاوہ تقریباً ۴۰ ایسے غیر فطری اعمال ہیں جو یورپ، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے بعد اب مشرقی معاشروں اور مسلمان ملکوں میں بھی پھیل رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ یہ بیماریاں مسلم معاشرے میں پوری طرح سرایت کریں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن وحدیث اور فقہی آرا و نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ تدبیریں اور پیش بندیاں کرنی ہوں گی۔ اس سیمینار کا مقصد نئی نسل بالخصوص طلبہ اور نوجوانوں کے اندر بیداری پیدا کرنا، ملت کے قائدین کو اس حساس مسئلے کی طرف ملتفت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا شرعی حل تجویز کرنا ہے۔ صدر اجلاس ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے اس اہم موضوع پر سیمینار کے انعقاد کو قابل تحسین قدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس پر اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنا وقت کا تقاضہ ہے۔ جنسی انحرافات کی تمام شکلیں انسانی فطرت سے بغاوت اور تہذیبی قدروں کو پامال کرتی ہیں۔ فقہ اسلامی کے مباحث میں ان تمام بداعمالیوں سے متعلق رہنمائی اور واضح احکامات موجود ہیں۔ قرآن مجید میں مرد وعورت کے علاوہ کسی تیسری جنس یعنی مخنث کا کوئی اشارہ موجود نہیں، یہ اصل میں نفسیاتی وذہنی بیمار ہوتے ہیں۔ مناسب علاج اور ذہنی تربیت کرکے انہیں بہت حد تک نارمل زندگی گذارنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد مبین سلیم نے پہلے سیمینار کے مرکزی موضوع کا تعارف پیش کیا اور سیمینار کے مختلف علمی اجلاسوں سے متعلق ضروری اعلانات بھی کیے۔ ان کے بیان کے مطابق اس موضوع پر ۳۶ مقالات موصول ہوئے لیکن ۳۳ مقالات ہی پیش کیے جاسکے۔

افتتاحی اجلاس سمیت سیمینار کے کل پانچ اجلاس ہوئے۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا علمی اور پانچواں اختتامی اجلاس تھا۔ پہلے علمی اجلاس کی صدارت پروفیسر ضیاء الدین فلاحی اور نظامت ڈاکٹر ارشد اقبال نے کی۔ اس میں کل آٹھ مقالات، دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ندیم اشرف اور نظامت نعمان بدر فلاحی نے کی، اس میں ۱۰ مقالات، تیسرے اجلاس کی صدارت مولانا جرجیس کریمی اور نظامت محمد مبشر نے کی، اس میں ۷ مقالات، چوتھے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبید اقبال عاصم اور

نظامت محمد اعظم نے کی، اس سیشن میں کل ۸ مقالات پیش کیے گئے۔ اختتامی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے کی۔ ان کے خطاب سے پہلے پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے اختتامی گفتگو میں کہا کہ الحمدللہ اس دوروزہ قومی سیمینار میں انسانی معاشرے میں جنسی آوارگی کی متنوع غیرفطری شکلوں کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس انارکی اور غیر فطری عمل کی عالمی مہم اور تحریک کی پشت پر دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کا ہاتھ ہے جس کا مطمح نظر محض نفع خوری ہے اور اپنے اس مقصد میں یہ طبقہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہے۔ اس سیمینار کے مقاصد میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا تھا کہ ہمارے طلبہ، علما، محققین اور دانشور حضرات اس مسئلے کی حساسیت اور نوعیت کو سمجھیں۔ مغرب کے تناظر میں یہ ایک سنگین انسانی المیہ ہے۔ اس کے سد باب کے لیے فی الحال تو یہ سیمینار بیداری کی ایک علمی کوشش ہے جس کے ذریعہ اسلام کا نقطۂ نظر، احتیاطی تدابیر اور حفظ ماتقدم کے لیے رہنما اصول پیش کیے جاسکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سیمینار کے علمی اجلاسوں میں پیش کیے گئے مقالات کے چشم کشا پہلو اور قیمتی علمی مباحث انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ اس میں اسلامیات، دینیات، تاریخ، عربی اور انگریزی ادب کے اسکالرس اور طلبہ کا بڑی تعداد میں مقالات کے ساتھ شریک ہونا ایک خوش آئند پہلو ہے۔ صدر اجلاس نے اپنے خطاب میں کہا کہ مغربی مفکرین نظریہ ساز عدل اور مساوات کے درمیان خلط مبحث کا شکار ہوگئے۔ آزادی کا جولا محدود اور الٰہی تعلیمات سے بے نیاز تصور وہاں قائم ہوا، اس نے اخلاقیات، انسانی مجد وشرف اور سماجی وتہذیبی اقدار وروایات کا بیڑا غرق کردیا۔ جنسیات کے متعلق فرائڈ کے نظریات وہاں اس قدر مقبول ہوئے کہ پھر کوئی حد باقی نہیں رہی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تمام جنسی آوارگیوں اور غیر فطری اعمال کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ اس دلدل سے انسانی معاشرے کو صرف قرآنی اصول وضوابط اور اسلامی احکامات پر سختی سے عمل ہی نکال سکتا ہے۔ کسی دوسرے مذہب اور نظام کے اندر اس کا کوئی واضح حل نہیں ہے۔ مرکز علوم القرآن مبارک باد کا مستحق ہے کہ جس موضوع پر بالعموم کوئی زبان نہیں کھولتا اس پر ادارے نے ایک مفید علمی مجلس کا انعقاد کیا۔ کلمات تشکر قاری حامد میاں نے پیش کیا۔ مرکز کی جانب سے اس مجموعے کی جلد اشاعت اور آئندہ فروری ۲۰۲۶ء میں "رزق حلال کی اہمیت قرآن وسنت کی روشنی میں" کے موضوع پر سیمینار کے انعقاد کا اعلان بھی کیا گیا۔ یہ رپورٹ نعمان بدر فلاحی کی فل اسکیپ سائز کے پانچ صفحات پر مشتمل مفصل رپورٹ کا خلاصہ ہے۔

(کلیم صفات اصلاحی)

وفیات

آہ! مولانا جعفر مسعود ندوی

(۱۹۶۰-۲۰۲۵ء)

محمد عمیر الصدیق ندوی

ادھر دو چار برسوں میں ندوۃ العلماء نے کیسے کیسے گوہر آبدار کھوئے، جن سے دارالعلوم کے ساتھ ندوۃ العلماء کے بہت کچھ کھو دینے اور محروم ہو جانے کا احساس مدتوں رہے گا۔ ان میں سب سے تازہ غم مولانا جعفر مسعود حسنی کے حادثۂ وفات کا ہے۔ ۱۵ر جنوری کی ایک شام ان کی زندگی کے آفتاب کے غروب ہونے کی علامت بن گئی۔ سڑک کے ایک حادثہ نے ان کو درجہ شہادت پر فائز کر دیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں وہ تکیہ کے اس خانوادہ میں پیدا ہوئے جہاں کے ہر فرد کو علم و فضل کے آسمان کا مہ پارہ اور سیارہ کہنا مبالغہ نہیں سمجھا جاتا، ان کو والد مولانا واضح رشید ندوی، عم بزرگوار مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا محمد ثانی حسنی، جد امجد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسی شخصیتوں کے سایہ میں پروان چڑھنے کی ایسی توفیق ملی جو کسی بھی خوش قسمت کے لیے شکر کے ساتھ قدر کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظر عام کے عہدہ اور منصب پر جب قریب سال ڈیڑھ سال پہلے وہ فائز ہوئے، تب اکثر لوگوں کو ان کی علمی، ادبی اور تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا اور اعتراف بھی ہوا لیکن جنہوں نے ان کو طالب علم اور پھر لکھنؤ کے مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں معلم کی صورت میں شروع سے دیکھا ان کی نظر میں وہ ناظر عام سے کہیں زیادہ منظور نظر کا مرتبہ رکھتے تھے اور مرتبہ بلند ملنے کے لیے یہ کہنا ہی کافی نہیں کہ ملا جس کو مل گیا، علمی و دینی روایات کا تسلسل کسی بھی علمی و خاندانی سلسلے کو زریں ہونے کی صفت عطا کر سکتا ہے لیکن زریں کو نورانی کی صفت میں بدلنے کے لیے توفیق ربانی کی تاثیر ناگزیر ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ایک بار لکھا اور اس کو دوسروں نے کئی بار دہرایا کہ مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اور مجدد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فضل و کمال اور مجاہدہ و حال کے دو آتشہ سے ایک اور سہ آتشہ تیار ہوا اور وہ سئی ندی کے کنارے چند گھروں پر مشتمل یہی خانوادہ سید احمد شہید تھا، جس نے نسبتوں کے تحفظ کی اسلامی روایات کی معنویت میں قابل رشک اضافہ

کیا۔ نسبتوں کی معنویت کی یہ برکت مولانا جعفر مسعود ندوی کے وجود میں منتقل ہوئی تو اس پر حیرت نہیں، حیرت اس بات پر بھی نہیں کہ پانچ سال پہلے ۱۶ر جنوری کو ان کے والد جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تب فجر کی اذان شروع ہونے کے ساتھ ان کی حیات ابدی کی صبح طلوع ہوئی تھی، ٹھیک پانچ سال بعد ۱۵ر جنوری کی شام کو ان کے بیٹے نے مغرب کی نماز کے بعد اس شب زندگی سے کنارہ کرلیا جس کے بعد کی اصل زندگی میں ظلمت شب کا کبھی گزر نہیں ہوسکتا۔ اپنے والد کی تاریخ وفات کے دن وہ اپنے والد کے پاس آسودۂ خاک ہوگئے۔ ولد کو سر ابیہ کہا جاتا ہے، ان کے والد مولانا واضح رشید مرحوم نے اپنی زندگی کے لمحات کو خاموشی، تنہائی، گوشہ گیری، کم سخنی، کم آمیزی اور حیا و خفا کے اصل معنوں سے آشنا کرایا تھا اور بتایا تھا کہ نام و نمود سے دوری اور شہرت طلبی سے بیزاری کے باوجود بے شمار دلوں میں گھر کیسے کیا جاتا ہے۔ مولانا جعفر مسعود نے کم عمری ہی میں جس طرح سر ابیہ کے معنوں کو حقیقت بخشی، کم اولادوں کو یہ توفیق ملتی ہے۔ اصل وراثت کا حق اور کیا ہوسکتا ہے؟ مولانا جعفر مسعود خاموشی سے ایک مدرسہ میں علوم اسلامی کی تدریس سے نیک نام ہوئے، لیکن عام تعارف کی وجہ یا ان کی خداداد صلاحیتوں کی خوشبو ان کی عربی اور اردو تحریریں بنتی رہیں۔ اردو اخباروں اور رسالوں میں ان کے کالم ان کے فکر کی بلندی کے ساتھ ان کی ادبی دلکشی اور زبان و بیان کی خوبصورتی کا نمونہ بنتے گئے، پڑھنے والوں کو ان کی تحریروں سے مولانا دریابادی کے ماجدی ادب کے لطف کا مزہ آتا۔ برسوں پہلے رابطہ ادب اسلامی کے ایک سیمینار میں ان کی تحریر کی داد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بے اختیار دی تھی اور کاروان زندگی میں مولانا نے اس سیمینار کی روداد میں خاص طور پر اس تحریر کا ذکر کیا تھا، لیکن مولانا جعفر کے اصل جوہر تو عربی نثر نگاری سے کھلے۔ ندوۃ العلماء کا عربی جریدہ الرائد دارالعلوم کے طلبہ کے لیے عربی صحافت میں مہارت کا شروع سے بہترین ذریعہ رہا۔ ۱۹۵۹ء سے شائع ہونے والے اس جریدے نے خدا جانے کتنوں کے لیے عربی نثر نگاری میں حصول کمال کی راہیں کھولیں۔ اس کا مقصد ہی یہی تھا، کوئی مادی نفع نہ تہذیب جدید کی تقلید، نہ زمانے کے تقاضوں کی ہمنوائی، مقصد صرف یہ کہ یہ جریدہ عقل کی غذا اور قلم کی دستگیری کا ہنر دے سکے۔ اس بامقصد رسالہ سے مولانا جعفر مسعود ۲۰۰۳ء میں اپنے ایک کالم "رکن الاطفال" کے ذریعہ وابستہ ہوئے۔ چند قسطوں کے بعد "اخی العزیز" کے عنوان سے یہ مستقل اور مقبول کالم بن گیا، جس میں اختصار کی خوبی کے ساتھ دینی، فکری اور عصری موضوعات پر مفید ترین خیالات کی کہکشاں سجنے لگی۔ یہ کالم مولانا جعفر مسعود کی شخصیت کا اصل

عکاس بھی ثابت ہوا، وہ کم عمری کے باوجود بڑی عمر والوں کی نظر میں بڑے بن گئے۔ ساتھ ہی ان کی خاکساری، فروتنی، حد درجہ تواضع، بے نفسی بھی اسی درجہ بڑھتی گئی۔ محبت اور اخلاق کی بلندی نے ان کو ان سے ملنے والوں کی ہر نظر میں محبوب بنا دیا تھا۔ ان کے ایک جد امجد مولانا فخر الدین خیالی کے بارے میں لکھا اور پڑھا گیا کہ خاموشی، صبر، قناعت اور حلم کی صفات ان کی ہر ادا سے ظاہر تھی اور یہ کہ ظاہر و باطن یکساں اور سینہ ایسا آئینہ تھا جو گرد و کدورت سے صاف تھا۔ صفات کا روایات میں بدلنا آسان نہیں لیکن جعفر مسعود مرحوم کی زندگی نے بتایا کہ یہ پاسداری بہ اندازہ ہمت بہرحال ممکن ہے۔ کئی کتابوں کے مؤلف اور مترجم ہونے کی شہرت کا احساس بھی نہیں ہونے دیا اور آخر میں ناظر عام کی حیثیت سے ناتجربہ کاری اور پے در پے بڑوں کے سایہ سے اچانک محروم والے نظام کی مشکلات کے باوجود انہوں نے نہایت کم وقت میں جس حسن انتظام اور خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا اس کو شاید ندوہ کی تاریخ میں کبھی بھلایا نہ جاسکے گا۔

وہ رابطہ ادب اسلامی کے صدر ہوئے تو کرونا کے بعد اس کی سرد ہوتی مجلسوں کو پہلی فرصت میں گرمی افکار و گفتار عطا کرنے میں منہمک ہو گئے۔ جے پور کی جامعۃ الہدایہ میں عرصہ بعد رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار کی روح وہی تھے لیکن ہر روح کی طرح مخفی اور نہاں۔ رابطہ کے سہ ماہی ترجمان کاروان ادب کی پابندی وقت سے اشاعت کے لیے فکر مند ہی نہیں بے چین تھے۔ اسی طرح مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے مالیاتی مسائل کے حل کے ساتھ اس کو ایک مستقل تحقیقی اور تصنیفی ادارے کی شکل میں دیکھنے کے منصوبہ ساز ہوئے۔ ان کی شبانہ روز کی محنت، متعلقہ شعبوں کے ذمہ داروں سے مخلصانہ تعلق اور ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید بلال عبدالحی حسنی سے ہمہ وقتی تعاون سے ندوہ کے تمام خیر خواہوں کو اطمینان تھا کہ یہ عظیم ادارہ کامیابی اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ مستقبل میں ان سے بڑی توقعات اس لیے وابستہ تھیں کہ ندوہ کے لیے وہ امیدوں کا مرکز نظر آنے لگے تھے۔ جعفر مسعود مرحوم کو یاد کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ الفاظ سامنے آجاتے ہیں، جو انہوں نے عبدالرحمن نگرامی ندوی کی وفات پر لکھے تھے کہ وہ انسان کی صورت میں فرشتہ تھے۔ نوجوان ہو کر اپنے اخلاق اور دینداری سے انہوں نے بوڑھوں کو شرمایا۔ دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں بلند درجات سے نوازے اور ندوہ اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر عماد الحسن آزاد فاروقی مرحوم

(م:۲۰۲۵ء)

افسوس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق پروفیسر عماد الحسن آزاد فاروقی نے بھی اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ صحیح معنوں میں فلسفی دانشور تھے۔گہرا مطالعہ اور اخذ نتائج کے لیے مطلوب ژرف نگاہی کی دولت ان کو ملی تھی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی آب وہوا میں ان کی پرورش اورنمود ہوئی، ان کے والد ضیاء الحسن فاروقی ملک کے مشہور ماہر تعلیم اوراستاذ الاساتذہ ہونے کے ساتھ بلند پایہ ادیب، محقق، صحافی اور مصنف ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے مدبر و منتظم بھی تھے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وہ وائس چانسلر بھی رہے۔ساتھ ہی وہ تصوف اور خانقاہی اثر و مذاق کے وارث بھی تھے۔عماد الحسن آزاد کو وراثت میں ان کے نامور والد سے جو دولت ملی اس میں علم و دانش اور قلم و قرطاس سے تعلق تو ظاہر ہے لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ سے والہانہ تعلق سرفہرست ہے۔

آزاد مرحوم نے دہلی یونیورسٹی، پٹیالہ یونیورسٹی، ٹیمپل یونیورسٹی امریکہ سے ایم اے ایم لٹ کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور پھر ایک معلم کی حیثیت سے ان کی ساری وابستگی جامعہ کے نام ہو گئی۔ ۱۹۷۶ء میں لیکچرر ۱۹۸۹ء میں ریڈر اور ۱۹۸۷ء میں پروفیسر ہونے کے تمام مدارج طے کرتے رہے۔ مذاہب عالم اور تقابل ادیان ان کا پسندیدہ موضوع اس طرح بنا کہ ان کے مقالات و تصانیف سب اسی موضوع کی نذر ہو گئے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انہوں نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے بعض امتیازات پر بھی ان کے مضامین قدر کی نظر سے دیکھے گئے۔اردو میں ان کے متعدد اور بیش قیمت مقالات بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔جامعہ کے علمی ترجمان اسلام اور عصر جدید میں یہ مضامین خاص طور پر چھپے۔

سنہ ۱۹۷۸ء میں عشق اور بھگتی کے نام سے ان کی کتاب شائع ہوئی۔ قامت میں یہ کہتر تھی لیکن موضوع اور مواد کے لحاظ سے یہ ہمیشہ کے لیے ان کی بہتر اور یادگار تحریر بن گئی۔ جذبۂ محبت کی ارفع و اعلی شکل ان کو عشق اور بھگتی میں نظر آئی۔یہ دو اصطلاحیں ہی نہیں دو مختلف تہذیبوں کے مشاہدے کا بڑا اشاریہ بھی تھیں۔ آزاد مرحوم نے مولانا روم اور سری راما کرشنا کی صورت میں دو تہذیبوں اور مذہبوں کے نمائندے تلاش کیے۔ ان کی زندگی اور تعلیمات کے مطالعہ کے بعد یہ

نتیجہ اخذ کیا کہ ان دونوں شخصیتوں نے زمانہ مذہب اور ماحول کے فرق و اختلاف کے باوجود جذبہ محبت سے حقیقت اعلی کا عرفان حاصل کیا۔ بتایا کہ محبت کا جذبہ انسانوں کی بنیادی وحدت کے ساتھ ان کے حقیقی مقصود کی بنیادی وحدت کا نشان ہے۔

ان کی دوسری اور موضوع کے لحاظ سے بہت اہم کتاب "دنیا کے بڑے مذہب" کے نام سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اسلام اور دیگر بڑے مذہبوں کے بارے میں بنیادی معلومات کے ساتھ یہ بتانا بھی ان کا مقصد تھا کہ یہ اندازہ ہوسکے کہ کن مختلف ادوار سے گزر کر مطالعۂ مذہب کا علم اس منزل تک آچکا ہے جہاں یہ توقع کی جاسکے کہ مختلف مذہبی روایتوں اور خود نفس مذہب کے ساتھ زیادہ انصاف کیسے ہو؟ کتاب میں ان کے مقدمے نے ان کے فلسفیانہ انداز فکر کو ان کی تنقیدی نظر پر غالب رہنے کا گویا اعلان کر دیا، حقیقت بھی شاید یہی ہے کہ وہ محقق و نقاد سے زیادہ فلسفی مزاج تھے اور یورپ کے جدید فلسفیوں سے زیادہ متاثر اور اسی لیے ان کے خوشہ چیں بھی تھے۔ گذشتہ صدی کے نصف آخر میں مسلم ملکوں اور معاشروں میں حیات، اساسیت یا بنیاد پرستی کے رجحانات کو انہوں نے اس محرومی اور مایوسی کا ردعمل قرار دیا جو مسلمانوں کو نو آبادیاتی نظام سے گلو خلاصی کے بعد اپنے آزاد معاشرے سے ہوئی، انہوں نے ان تحریکوں کو پیچیدہ قرار دیا لیکن پیچیدگی کے اظہار کے لیے انہوں نے یک طرفہ یا یک رخا انداز نہیں اختیار کیا۔ ۱۹۸۵ء میں ہند اسلامی تہذیب کے ارتقا کے نام وعنوان سے چند مقالات کا ایک مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا، یہ مقالات جامعہ ملیہ کے ایک سیمینار میں پیش کیے گئے تھے۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں فن مصوری اور خطاطی میں مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق کے متعلق یہ کہا کہ مصوری سے خطاطی کی طرف آنا یہ تخلیقی دھارے کا راستہ بدلنا تھا۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ ظاہر کی کہ قرآن شریف اسلامی تمدن کا سب سے اہم سرچشمہ تھا اور اس کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت دیکھنے کی خواہش نے فن خطاطی کو ترقی دی۔ اس قسم کے خیالات کی جدت اور ندرت سے توقع تھی کہ آزاد فاروقی فلسفہ و مذہب و ادب کے امتزاج سے اردو زبان کی دنیائے فکر و نظر کو نئی تازگی دیں گے، مگر شاید بعض اعذار و آزار سے وہ آزاد نہ ہوسکے۔ ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ انسانی وجود اپنی گہرائیوں تک پورے طور سے مطمئن اور سیر ہوجائے ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

سنہ ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین نے اسلام اور مستشرقین سیمینار کا انعقاد کیا، اس میں وہ شریک ہوئے اور متانت اور علمی سنجیدگی کی چھاپ چھوڑ گئے۔ تفکر و تدبر کی خوبیوں سے وہ جامعہ ملیہ کی روشن مثالوں میں شمار کیے جاتے رہیں گے۔ اللہ تعالی مغفرت فرمائے۔

ڈاکٹر تابش مہدی مرحوم

(۱۹۴۸-۲۰۲۵ء)

افسوس ماہ جنوری میں جناب تابش مہدی بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اس سخن وری کی ویرانی کا احساس بڑھا گئے جو خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے اور کسی صالح و مثبت تبدیلی کی تمنا رکھتی ہے۔ پاکیزہ اور اعلیٰ و ارفع قدروں پر ایمان رکھ کر دوسروں کو بھی اس دولت میں شریک کرنے کی خواہش یوں بھی اب ہر کسی کے دل میں نہیں رہ گئی۔ اسی لیے تابش مہدی مرحوم کی کمی کا احساس ان کے جانے کے بعد زیادہ اذیت ناک ہوگیا۔

۲۵ر جنوری ان کی دنیوی زندگی کی تقویم کی آخری تاریخ تھی، قریب تہتر سال کی عمر پائی اور اس عمر میں انہوں نے شاید زندگی کے ہر نشیب و فراز کی حقیقت بھی پالی ورنہ ان ہی کے الفاظ میں:

وہ دھوپ تھی کہ میں اس میں جھلس گیا ہوتا

جونپور سے قریب ضلع پرتاپ گڑھ کے ایک گاؤں رام دیوپٹی کے رہنے والے اور پرتاپ گڑھ ہی کے ایک اور گاؤں ناجیہ پور میں پیدا ہونے والے اور نانانانی کا احسان زندگی بھر یاد رکھنے والے اور والد اور دادیہال سے برائے نام تعلق کو یہ کہہ کر نظر انداز کرنے والے کہ "ادھر کبھی توجہ ہوئی ہی نہیں"، تابش مہدی کی کتاب زندگی کی یہ پہلی عبارتیں ہیں اور ان ہی سے اس پوری کتاب کا مضمون سمجھ میں آسکتا ہے، اس کے بعد ان کی زندگی، سفر کا دوسرا نام بن کر رہ گئی۔ گیارہ بارہ برس کی عمر سے شروع ہونے والے اس سفر سے وہ بیسوں برس پہلے ہی تھک جانے کا اظہار کرچکے تھے۔ کم عمری ہی میں ناجیہ پور سے نکلے تو بہرائچ، الہ آباد، مرادآباد، امروہہ، لکھنؤ، جون پور اور پھر دہلی سب زندگی کے ردیف قافیہ بن کر ان کے لیے اس حقیقت کی پرتیں کھولتے رہے کہ سفر ہی سے آذوقہ حیات ہے۔

اس آذوقہ حیات کی فراہمی کا ذریعہ ان کی شاعری بنی۔ جس کا بڑا حصہ نعتیہ کلام کا تھا اور اسی مبارک صنف سخن نے واقعۃً ان کی شاعری کو بڑا بنا دیا۔ سب جانتے ہیں کہ نعت گوئی، اردو شاعری کا لازمی جزو ہے، گو یہ دوسرے اصناف سخن سے کمیت میں کم ہے۔ اس میں اظہار جذبات کی طاقتور تاثیر کی فراوانی کے باوجود مقام رسالت و نبوت کے حدود کی رعایت اور اس کی نزاکت کا خیال ولحاظ شاید اس کمی کا سبب رہا اور شاعروں کے لیے وجہ آزمائش بھی۔ لیکن تابش مہدی نے جس طرح آداب و حدود نعت کی نگہداری کی، اس کو دیکھ کر اہل نظر نے زائر حرم حمید صدیقی لکھنوی کے

بعد خالص نعت گوئی میں دوبارہ فصل گل کی بہار کا منظر پالیا۔ تابش مہدی نے اپنی خوش فکری اور خوش عقیدگی کے ساتھ اپنے ترنم میں رگ جاں کا وہ ارتعاش شامل کر دیا جس نے ان کے ترنم کو جگر مرادآبادی کی طرح ایک الگ ہی پہچان دے دی۔ ان کا یہ ارمان تھا کہ:

پہچان ہو مداح پیمبرؐ کے لقب سے

یہ تمنا اس طرح بار آور ثابت ہوئی کہ نعتوں کے کئی مجموعے جیسے لمعات حرم، سلسبیل، صبح صادق اور طوبیٰ ان کے سرمایۂ شعر میں شامل ہو کر ذخیرۂ آخرت میں بدل گئے۔

زندگی کے سفر کے آغاز میں تجوید و قرآت کا ہنر ان کا زاد سفر تھا ان کو کیا معلوم تھا کہ رہنمائے تجوید کا رسالہ ان کی سخن گوئی کی تمہید بن جائے گا۔ لیکن اسی کی برکت تھی کہ غزل کے مزاج داں ہونے تک، ان کی نوائے سخن کا آہنگ حجازی ہی رہا۔ وہ غزلیں کہتے رہے، خوشبو کا کاروبار کرتے رہے لیکن خوشبو، نسیم، چاندنی، اختر کی ساری تشبیہیں اور تعبیریں اور سخن وری اور نغمہ و ساز کی ساری علامتیں صرف اس لیے ظاہر ہوتی رہیں کہ ان کو یقین تھا کہ:

مرا سلسلہ ہے حجاز سے

زندگی میں ان کے کارناموں پر یا تو نظر کم پڑی یا نقادوں کے اپنے تنقیدی بازار میں سستے سامان کی نمائش میں ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی کہ پاکیزہ فکر اور بامقصد نظریہ ادب کی جانب توجہ دلائی جاتی۔ تابش مہدی مشک غزالاں، غزل نامہ، تعبیر اور کنکر بولتے ہیں جیسے غزلیاتی مجموعوں سے تہذیب جذبات و احساسات اور تہذیب غم کائنات کی سوچ کا اشاریہ تیار کرتے رہے کہ:

سوچو تو ایک گنج معانی غزل میں ہے

تابش کی نعت اور غزل گوئی میں جذبات کی پاکیزگی اور فکر کی بلندی کی بات جب بھی ہوگی ان کی یہ بات بھی دہرائی جائے گی کہ نثر ہو یا شعر، برتری فن کو حاصل ہوگی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے تابش مہدی کے نظریہ ادب کو باطن کی سراغ رسانی سے تعبیر کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے اور اسی لیے وہ اپنے عہد کے اکثر ادبی رجحانات، تحریکات اور نظریات سے باخبر رہے۔ گرچہ بنیادی طور پر وہ اس ادب کے نقیب و نمائندہ تھے جس کا رشتہ انسان اور ادب کے کامل ترین نظام یعنی اسلام سے ہے اور جو ہر عہد کے مثبت و منفی رویوں سے باخبری کا دوسرا نام بھی ہے۔ اس عقیدہ پر یقین رکھنے کے باوجود تابش مہدی، ادب میں تعصب، تحزب اور گروہ بندی کے افسوں میں گرفتار نہیں ہوئے۔ مشک غزالاں میں مقدمہ کے طور پر نظریہ شعر و ادب پر ان کی عمدہ اور فکر انگیز بحث ان کے تنقیدی شعور

کی بالیدگی کی دلیل ہے اور اس کا مظہر نقد غزل، حالی شبلی اور اقبال، اردو تنقید کا سفر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تناظر میں، شفیق جونپوری اور طاہر تلہری جیسی کتابیں ہیں، نقد غزل میں انہوں نے جن شاعروں اور ان کے شعری کمالات کے تعین کا انتخاب کیا، ان میں نشورواحدی، کلیم عاجز، حفیظ میرٹھی کے ساتھ شجاع سالم اور اعجاز رحمانی جیسے کم معروف نام شامل ہیں جو ان کے میزان نقد کے شاہد عدل بھی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہیں جن کو طہارت فکر کا شاعر کہہ کر انہوں نے اپنی اسی تنقیدی نظر کا اثبات کر دیا جس کو باطن کی سراغ رسانی سے بجا طور پر تعبیر کیا گیا۔

تابش مہدی جیتے جی اپنی دنیا کو جس طرح آباد کرتے رہے، افسوس ہے کہ صحیح معنوں میں اس کا ادراک ہوا نہ اعتراف۔ تنوع کی خوبیوں سے لبریز ان کی کتابیں، اب ان کی ثناخواں بھی ہیں اور مرثیہ خواں بھی کہ ایک بے نیاز اور بے غرض صاحب کمال سے ایسی بے نیازی کیوں برتی گئی ہے انہوں نے ابوالمجاہد زاہد اور شوکت پردیسی کے کلام کی ترتیب و اشاعت سے بتایا کہ ادب کو زندگی کی صالح قدروں سے آشنا کرنے کا عمل کسی بھی بندش سے آزاد ہے، اسی مقصد نے ان کے ذریعہ میر امطالعہ جیسی مفید ترین کتاب تیار کرائی، زندگی کے سفر میں جتنے بھی مقام آئے ہر جگہ ان کے ہاتھوں اور شانوں پر علم و ادب کا سامان ہی ان کی پہچان رہا، وہ تھکتے رہے اور ختم سفر کی تمنا کی پرورش کرتے رہے مگر مقدر میں ان کا وہ سفر بھی تھا جس کی تھکن کا مزا ہی اور ہے۔ انہوں نے 'وہ گلیاں یاد آتی ہیں' لکھ کر اردو سفرناموں کی روایت میں اضافہ ہی نہیں کیا، زندگی کے سفر کی تھکن کو منزل مقصود ملنے کی راحت و مسرت میں بدل جانے کا شکرانہ بھی ادا کر دیا اور اب جبکہ حقیقی زندگی کا سفر شروع ہوا ہے وہ فرشتوں کی محفل میں غزل سرا ہوں گے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

مر کے تابش آپ کے جوہر کھلے

تبصرۂ کتب

پروفیسر محمد طاہر، صحابیاتؓ اور نسائی تحریکات،، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۳۱، قیمت: ۲۳۰روپے، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، پتہ: شبلی نیشنل کالج، شعبۂ اردو، اعظم گڑھ، دارالمصنّفین اور علی گڑھ اور مئو کے مشہور مکتبے۔

شبلی کالج کی نیک نامیوں کی فہرست میں گذشتہ برسوں میں جن کارگزاریوں سے اضافہ ہوا ان میں خاص طور پر وہ سمیناری سلسلہ ہے جس کے ذریعہ امہات المومنینؓ اور صحابیاتؓ کی سیرت کے پاکیزہ، مثالی اور لائق تقلید نقوش اجاگر کیے جاتے رہے۔ اس مبارک کوشش میں کالج کے شعبۂ اردو کے صدر اور اس کتاب کے مرتب پروفیسر محمد طاہر کا جذبہ سب سے نمایاں رہا۔ انہوں نے دور جدید میں عالم نسواں کی بربادی اور ان کے حقوق کے نام پر ان کی پامالی اور عام طور سے نئے دور کی چمک دمک میں خود خواتین کی بے راہ روی اور انسانوں کی اس نصف آبادی کی زبوں حالی کا درد محسوس کیا، اس کے درماں کے لیے انہوں نے امت کی ماؤں اور خواتین کی زندگیوں سے فیضان حاصل کرنے کے لیے متعدد بین الاقوامی سمیناروں کا انعقاد کیا کہ یہ محض ہندوستان کی خواتین ہی نہیں، تمام عالم نسواں کے لیے اسلام کے پیغام کا ذریعہ بن جائیں۔ ان سمیناروں کے اجلاس، مضامین وسامعین کی کثرت کی وجہ سے کارگر اور مفید ثابت ہوئے اور ان کی افادیت کو دیرپا رکھنے کے لیے سیرت امہات المؤمنینؓ اور مومنوں کی مائیں، مقدس مائیں، امت کی مائیں، صحابیات طیبات کے نام سے مقالات کے مجموعے شایع ہوئے، بعض کتابوں کے عربی، ہندی اور انگریزی ایڈیشنوں کی بھی اشاعت عمل میں آئی۔ زیرنظر کتاب بھی اسی نہایت ضروری اور مفید سلسلے کا حصہ ہے جس میں جدید نسائی اور مسلم معاشروں میں حقوق نسواں، خوداختیاری اور آزادی کے نام پر برپا ہونے والی تحریکوں پر بہترین تنقیدی تحریروں کے ساتھ امت کی ممتاز ترین خواتین کی زندگیوں کا مطالعہ اور جائزہ لیا گیا اور یہ زیادہ تر خواتین ہی کے قلم سے ہے اور اس احساس کے ساتھ ہے کہ صحابیات کی زندگی اور ان کا کردار اور دوسری نسائی تحریکوں کا معاملہ ومطالعہ نہایت

حساس ہے اور یہ کئی زاویوں کا متقاضی اس لیے بھی ہے کہ یہ موضوع عموماً افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ فاضل مرتب کا یقین ہے کہ خواتین کو سب سے زیادہ بے آبرو یورپ نے کیا۔ یہ موجودہ دور کا بیانیہ ہے ورنہ اسلام سے پہلے جس طرح خواتین کا وجود ضروری ہوتے ہوئے بھی سماج کے لیے باعث ننگ سمجھا گیا، اس کی تاریخ سے سب واقف ہیں۔ اسلام آیا تو بقول مرتب نسائی تحریکات کا کوئی ایسا مطالبہ نہیں جس کو اسلام نے چودہ سو سال پہلے ہی تسلیم نہ کرلیا ہو اور جس کا مکمل اظہار سیرت صحابیات سے ملتا ہے۔ اس لیے عورتوں کی حرمت وتقدیس کی برقراری کے لیے سیرت صحابیات پر عمل کرنے کی بے قراری کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر مسلم خواتین کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے۔ مضامین کے علاوہ فاضل مرتب کا مقدمہ جو اذان سحر کے عنوان سے ہے بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ خواتین کی زندگی کی پاکیزہ اور صاف شفاف صبح کے لیے اس اذان پر لبیک کہنا ہی ہوگا۔　　　　(محمد عمیر الصدیق ندوی)

مولانا جعفر مسعود الحسنی الندوی، اخی العزیز، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۵۳۶، قیمت: ۴۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، پتہ: المجمع الاسلامی العلمی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور لکھنؤ ہی کے دوسرے مشہور مکتبے۔

انسانی معاشرہ کے طورطریق کے بے شمار پہلوؤں کے تعلق سے چھوٹی چھوٹی دو تین صفحوں میں سمٹ جانے والی سینکڑوں تحریروں کا یہ وہ مجموعہ ہے جس کو ندوۃ العلماء کے مشہور عربی جریدہ الرائد کے صفحات سے عطر کی صورت کشید کیا گیا۔ حقیقی عظمت، ماہ رمضان اور حق رمضان، حقیقی عید، زندگی اور زندگی کے درمیان، اپنا محاسبہ آپ، زندگی کی رزم گاہ میں، ہماری فطرت، بہاروں کا موسم، احساس خوف، یہ محض چند عربی عنوانات کا ترجمہ ہیں، ورنہ دین دنیا کے تعلق سے ایک سے بڑھ کر ایک متاثر کن تحریریں عربی قارئین کے لیے گویا قرآن وحدیث کی تفسیریں اور تشریحیں بن گئیں۔ یہ کالم کئی عنوانوں سے برسوں سے جاری ہے، افسوس یہ ہے کہ جس صاحب قلب ونظر نے اسلامی ادب کے یہ پھول کھلائے تھے، اب وہ آسودہ خاک ہے لیکن یہ بھی ہے کہ علم وحکمت کے ان پھولوں کی بہار اور ان کی خوشبو پھیلتی رہے گی۔ ان رنگارنگ پاک خیالات کی آبیاری میں خون جگر کی آمیزش صاف ظاہر ہے۔ یہ ہنر مرحوم مصنف کو اپنے والد کی ہدایتوں اور نصیحتوں کے طفیل ملا

جس کا ذکر انہوں نے کلمۃ المولف میں بڑے والہانہ انداز سے کیا کہ یہ سارا سرمایہ والد کے فیضان نظر کا ہے اصل عبارت کے چند الفاظ یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں کہ والدی الذی قل نظیرہ فی اعداد النفوس وتغذیۃ العقول وصقل المواھب واثارۃ الرغبۃ فی الکتابۃ وتمیتہ الملکۃ البیانیۃ واعطاء الفرص لتلامیذتہ وفتح الابواب وتمہیدالطرق الخ۔

اس کتاب کی افادیت ونافعیت کا تقاضا ہے کہ اس کو اردو قالب بھی عطا کیا جائے۔(ع۔ص)

ڈاکٹر مشیر احمد، ظفر احمد صدیقی عکس و نقش، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۴۷۰، قیمت: ۵۰۰ روپے، سن اشاعت ۲۰۲۴ء، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، راعی بک ڈپو الٰہ آباد اور امین بک ڈپو بخشی بازار، گورکھپور۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی، چند برس پہلے دور حاضر کے ان اہل علم و نظر میں شمار ہوتے تھے جن کے بارے میں خیال تھا کہ مستقبل میں اردو تنقید وتحقیق کی حکمرانی ان ہی کے حصے میں آئے گی۔ مکتب و مدرسہ کے محراب ودر سے اٹھ کر عصری دانش گاہوں کے ایوانوں میں عالمانہ جلوہ جیسا انہوں نے دکھایا وہ قدیم وجدید دونوں کے لیے خیرہ کن بن گیا۔ اردو، عربی اور فارسی ادبیات اور اسلامی علوم میں مہارت نے ان کو ہر طبقے میں درجۂ اعتبار عطا کردیا۔ مکتب کی کرامتوں میں ان کی معلمانہ ومدرسانہ شان کا ظہور بھی ہمیشہ داد طلب رہا۔ اپنی ذات سے ایک انجمن شخصیت، کرونا کی وبا کی زد میں آکر خاموش اور روپوش ہوگئی، مگر ان کی یادوں کے چراغ بہرحال روشن رہنے والے تھے۔ زیر نظر کتاب میں ان کے ایک لائق شاگرد نے اپنے استاد کی روشن زندگی کے عکس و نقش کو جس سلیقے سے سمیٹا ہے وہ واقعی داد کے لائق ہے اور یقیناً اس لائق ہے کہ یہ مستقبل میں ظفر صدیقی مرحوم کو جاننے اور پرکھنے والوں کے لیے سب سے زیادہ مستند، معتبر اور موقر مرجع قرار پائے۔ عکس کے نام سے ظفر صدیقی مرحوم کی ذات وصفات کے بیان میں مولانا سید محمد رابع ندویؒ، پروفیسر قاضی افضال حسین، قاضی جمال حسین، ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی جیسے جوہر شناسوں کی وقیع تحریریں ہیں تو کئی اہل خانہ کی تاثراتی تحریریں بھی ہیں جن سے بھائی، بابا، بھیا کی حیثیت سے ان کی ایک نہایت جاذب متاثر کن تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

دوسرا عنوان نقش کا ہے جس میں شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر ظفر الاسلام، پروفیسر عراق رضا زیدی، ٹی۔ آر۔ رینا، شمس بدایونی، طارق سعید، احمد محفوظ جیسے بڑوں کے ساتھ تنقیدی وتحقیقی نئی نسل

کے ممتاز نام شامل ہیں۔

ظفر احمد صدیقی کی ایک پہچان نظم طباطبائی کی شرح دیوان غالب کی بلند پایہ تحقیق سے ہے، قصیدہ کے فن اور تاریخ میں ان کے تبحر کو بھی امتیاز حاصل ہوا لیکن ان کی اصل شناخت، مطالعۂ شبلی سے قائم ہوئی، شبلی پر ان کی کتابوں کو جداگانہ شناخت کا درجہ ملا۔ ان کے خطبات اور علمی مجالس میں پیش کیے گئے مقالات میں جابجا شبلی پوری شان سے جلوہ گر نظر آتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ ان کی نگرانی میں بیس سے زیادہ ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے مقالوں میں شبلیات کا کوئی نشان نہیں۔ اس کتاب کی قابل قدر خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ظفر صاحب کے تمام تحریری اکتسابات کا مکمل استقصا ہے جو در حقیقت ظفر احمد صدیقی کے علم کی وسعت و عظمت کا ایک جہان بن گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں مرحوم کے چند منتخب مضامین ایسے ہیں جو مضمون نگار عالم میں امتخاب ہونے کی دلیل ہیں۔ لائق مرتب کی محنت بے ساختہ داد دینے پر مجبور کرتی ہے۔ تلاش و تفحص کا یہ سلیقہ ان کے مستقبل کے شاندار ہونے کا اعلان بھی ہے۔ (ع۔ ص)

مولانا عبد العلی فاروقی، اکثر یاد آتے ہیں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۳۰۰ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۳ء، پتہ: مکتبہ البدر، کاکوری، لکھنؤ، پن نمبر ۲۲۶۱۰۱، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۱۱۰۴۶۳

اس کتاب کے مصنف اودھ کی تہذیب و ثقافت کی ان باقیات میں سے ہیں جن کی شیریں بیانی، شائستگی اور شگفتہ مزاجی سے اودھ کی قدیم شرافت کے حامل خانوادوں کی روایت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس روایت میں خانوادۂ مولانا عبد الشکور فاروقی کاکوروی کی علمی و فقہی اور تاریخی و نظریاتی کاوشوں کی شمولیت کا رنگ بھی کمال کا ہے۔ کاکوری سے شائع ہونے والا رسالہ البدر اسی کمال کا جلوہ گاہ ہے جس کے مدیر اور اس کتاب کے فاضل دیوبند مصنف کا قلم مصور کے برش کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیر نظر کتاب کے مضامین کی فضا سوگوارانہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ان چند یادوں پر مشتمل ہے جو حسرت بھری داستانوں میں بدل گئیں۔

یادوں کی اس دنیا میں جہاں مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی، مفتی سعید احمد، ملک زادہ منظور، حفیظ نعمانی، انور جلال پوری، حسین امین، سید ضیاء الحسن

ندوی وغیرہ جیسے مشاہیر ہیں وہیں گھر اور بستی کی کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کا ذکر عموماً قلم کی زبان پر نہیں آتا مگر ان کا کردار کسی بھی زندگی کو یادگار بنا دیتا ہے۔ جیسے مصنف کو اپنی نانی اس لیے یاد آئیں کہ ان کی دعائیں ہر مشکل مرحلے پر سوغات بن کام آتی تھیں۔ اس طرح محلہ کی مسجد میں ہمیشہ موجود رہنے والے خمیدہ کمر اور بوسیدہ پوٹلی والے ایک بوڑھے بڑے میاں ہیں، ایسے کردار قصبات میں عموماً مل جاتے تھے، ایسوں کے ذکر سے جو درد آمیز سبق ملتا ہے وہ اصلاً زندگی کی اصل تصویر بن جاتا ہے۔ جیسے بچپن میں ناظرہ و حافظہ والے حافظ جی، ایسوں کی سیرت نگاری میں تصنع اور لفاظی کی جگہ سچے اور سادہ بیان کا کیف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کتاب کی سب سے موثر اور جذباتی تحریر 'خدا حافظ امی' ہے۔ ایسی ہی تحریریں ہوتی ہیں جو واقعتاً کہیں آنسوؤں سے لکھی تو کہیں آنسوؤں سے دھلی ہوتی ہیں۔ صاحب تحریر اگر صاحب دل بھی ہو تو اس کے جذبات میں پڑھنے والا اپنے غموں کی سوزش اور کسک کے ساتھ یہی کہتا نظر آتا ہے کہ یہ جانے والے وہ ہیں جو اکثر یاد آتے ہیں۔ (ع۔ص)

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، نگارشات ناصر (مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی)، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۴۴۴، ملنے کا پتہ: براؤن بکس، علی گڑھ، سن اشاعت، ۲۰۲۳ء، قیمت: ۷۵۰ روپے، ای میل: bbpublication@gmail.com

مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی مرحوم بڑے منضبط اور اصولی شخص تھے۔ ان کے چہرے پر مدرسۃ الاصلاح کی مشہور زمانہ علمی سادگی، اخلاقی وضع داری، انکساری، باطنی رعب و دبدبہ کا عکس محسوس ہوتا تھا۔ ان کا شمار ان قابل فخر اصلاحیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے صف اول کے اصلاحی فضلاء سے اکتساب علم کیا تھا۔ ان کی ذات ہندوستان کے چار معروف اداروں مدرسۃ الاصلاح، جامعہ ملیہ اسلامیہ، شبلی کالج اور دار المصنّفین کے قدیم ارباب اثر و نفوذ میں یکساں متعارف تھی۔ یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ فراغت کے بعد مدرسۃ الاصلاح کی خدمت کے لیے ان کے انتخاب میں مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی وغیرہ کا ایما بھی شامل تھا۔ ان کے سینہ میں گذشتہ غیر منقسم اور منقسم ہندوستان کی علمی، تعلیمی بالخصوص مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ کا ایک خزانہ دفن تھا جس کی جھلک زیر نظر کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مطالعہ کے شوقین طلبہ اور عام اہل علم تو ان کی کتاب مختصر حیات حمید اور

مکتوبات خلیل الرحمٰن اعظمی اور ماہنامہ الاصلاح، سرائے میر میں ان کے شائع شدہ چند مقالات ہی سے واقف تھے لیکن مرتب کتاب نے ان کی خاکہ ووفیات نگاری، تذکرہ نگاری، مقالہ نگاری، تبصرہ نگاری، مکتوب نگاری، بیاض نگاری، صحافت اور شعر وشاعری سے متعلق جو تحریریں سلیقے سے پیش کی ہیں، ان سے عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی مرحوم کی جامعیت اور اختصار وایجاز پسندی کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نگارشات ناصر کے نگار خانے میں علم وادب اور شعر وشاعری کے جام وسبو بھی ہیں اور داغ ہائے فراق دینے والے اساتذہ ومعاصر ارباب علم ودانش کے لیے درد وغم کے آنسو بھی۔ ادب صالح کا لطف بھی ہے اور ادب لطیف کا مزہ بھی۔ صاحب کتاب کی تصنیفی وتالیفی لیاقت کا ثبوت بھی ہے اور خطیبانہ ذوق وشوق کا ظہور بھی۔ تنقید نگاری کی اعلی وارفع مثالیں بھی ہیں اور تبصرہ نگاری کا عمدہ نمونہ بھی۔ ناصر صاحب نے یوں تو لکھا کم ہے لیکن جو لکھا ہے اس میں زبان وبیان کی سادگی وبرجستگی، اسلوب کی شستگی وشگفتگی کا وہی عکس وانداز نمایاں ہے جو دبستان شبلی کا طرۂ امتیاز ہے۔ سب سے خاص بات جو ان مضامین اور تحریروں کو پڑھ کر محسوس ہوتی ہے وہ ان کی تصویر کشی ومرقع آرائی ہے۔ جب کسی کا تذکرہ یا کوئی تاریخی واقعہ بیان کرتے ہیں تو پورے مناظر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پروفیسر مجیب صاحب ناصر صاحب کے استاد اور دارالمصنّفین کی گولڈن جبلی کے معزز ومحترم مہمانوں میں شامل تھے۔ ان کے تذکرے میں اس عظیم الشان تقریب میں اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے واقعات نقل کیے ہیں جو دارالمصنفین کی معلوم تاریخ سے ہٹ کر مگر اس کا حصہ ہیں۔

کتاب میں جگہ جگہ دل کو چھو لینے والے جملے ہیں۔ ص ۴۰ پر مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین کے رکن ڈاکٹر محمد معظم صاحب کے تذکرے میں لکھتے ہیں "ان کو دیکھ کر جہاں یہ دکھ ہوا کہ وہ بیمار ہیں وہیں یہ خوشی بھی ہوئی کہ بہت آرام سے ہیں۔" عبد اللطیف صاحب اور اپنے مزاج کے باب میں لکھتے ہیں "میرا بہت دنوں سے لطیف صاحب کا ساتھ ہے۔ امتداد زمانہ اور دوری مسافت کے باوجود ہم دونوں کے تعلقات استوار تر ہوتے گئے۔ میں بہت سوچتا ہوں کہ ہم دونوں میں قدر مشترک کیا ہے؟ بظاہر ہم دونوں متضاد طبیعت کے مالک ہیں۔ میں ابتدائے عشق پر رونے لگتا

ہوں اور وہ انتہائے عشق پر مسکراتے ہیں، میں مشکلات کا سامنا ہوتے ہی گھبرا جاتا ہوں اور وہ موج حوادث سے بھی ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں، پھر بھی دونوں اس طرح ساتھ چل رہے ہیں جیسے سنگم پر دو دریا"۔(۹۳) ایک جگہ لکھتے ہیں "پیری میں تو سبھی پارسا ہوتے ہیں، بات تو جب ہے کہ درمیان قعر دریا تردامنی سے باز رہے۔ بے چارہ ساحل کا تماشائی تردامنی کو کیا جانے؟"(ص ۹۸)۔ مخصوص اسلوب میں مرتب کے بیش قیمت حواشی سے کتاب کی ضخامت ضرور بڑھ گئی لیکن ان کی افادیت اور الگ لطف سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ص ۸۰ پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو دارالمصنّفین کا صدر لکھا گیا ہے حالاں کہ وہ مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ ص ۸۸ پر منقول غالب کے فارسی شعر کے مصرع "بیاوریدگراینجابود سخن دانے" کی صحیح قرأت یہ ہوگی۔ "بیاوریدگر ایں جا بود زباں دانے"، مصرع ثانی اس طرح ہے "غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد"۔ ص ۲۶۴ پر فیض احمد فیض کے مشہور شعر کا مصرع اول اس طرح منقول ہے، "وہ بات فسانے ہیں جس کا ذکر نہ تھا"، حالانکہ صحیح یہ ہے "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا"۔ بہر حال مرتب اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی کاوش سے یہ قیمتی سرمایہ شائقین تک پہنچا۔ (کلیم صفات اصلاحی)

مولانا ضیاء الحق خیر آبادی (مرتب)، نگارشات مولانا خالد کمال، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۴۲۴، ملنے کا پتہ: ضیاء الکتب، خیر آباد، ضلع مئو، پن کوڈ: ۲۷۶۴۰۳، سن اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۳۵۳۲۷۵۷۶، ای میل: zeyaulhaque@gmail.com

مولانا خالد کمال مرحوم عالمی شہرت یافتہ عالم و مصنّف مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے خلف الرشید اوران کے بڑے صاحب زادے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا ذوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ تعلیم دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں حاصل کی تھی۔ اس کے بعد دارالافتا، ریاض کی جانب سے تبلیغ و دعوت کے کام میں لگ گئے اور وطن سے دور اس فریضے کی ادائیگی میں نہ جانے کن کن مغربی اور افریقی ممالک کی خاک چھانی۔ گھانا (افریقہ) میں چودہ برس اور نیوزی لینڈ میں آخری ایام گذارے۔ انہوں نے تسلسل کے ساتھ مختلف موضوعات پر مقالات تحریر کیے تھے۔ یہ کتاب ان ہی مضامین و مقالات، خطبات، مکتوبات اور مختلف اسفار کا مجموعہ ہے۔ مقالات زیادہ تر البلاغ بمبئی اور دیوبند کے متعدد رسائل میں ۶۰،۷۰ سال پہلے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔ آخر میں ان کے شعری ذوق کے اندازہ کے لیے نمونۃً چند نظمیں، غزلیں اور مرثیے بھی ہیں۔

مقدمہ میں مرتب نے مولانا خالد کمال اور زیر نظر کتاب کا جامع تعارف تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد حاصل شدہ مواد کو موضوعاتی لحاظ سے دس ابواب میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ دینی و اسلامی موضوعات میں حج و حرمین سے متعلق معلومات کو پہلے، اس کے بعد تاریخ یعنی عربی تاریخ نگاری، عالمی تہذیب پر عربی تہذیب کے اثرات، پھر اسلاف یعنی جیش امامہ اور خلفائے اربعہ اور علمائے اسلام کی قوت حفظ اور حافظہ، پھر اہم شخصیات عباس بن فرناس، امام رازی، جلال الدین سیوطی وغیرہ سے متعلق مقالات ہیں۔ پھر مکاتیب اور سفر نامے ہیں۔ تعلیمات اسلام سے معنون باب کے تحت عبادتوں میں اعتدال، اسلامی زندگی میں شرم و حیا کا مقام وغیرہ موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے۔ پھر خطیب جمعہ کی حیثیت سے ان کے تین اہم خطبات اسرائیل کے وجود کا تاریخی پس منظر، دیار غیر اور مغربی ممالک میں مسلمان کے عنوان سے ہیں۔ آخری باب متفرقات میں اعجاز قرآن اور تصوف اور اخلاق کے موضوع پر مختصر مقالے میں عالمانہ و مؤرخانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ مقالات سب کے سب مفید اور مولانا کی ان موضوعات پر گہری نظر کے غماز اور اخذ و استنتاج کی عمدہ صلاحیتوں اور رواں اسلوب نگارش کا ثبوت ہیں۔ اندلس کے دردناک ماضی کو پیش کر کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کی کوشش بالعموم کی جاتی ہے لیکن مولانا نے اپنے مضمون فسانۂ اندلس میں تقریباً ۶۰ سال قبل اس کی حالت سے اس وقت یہ مثبت نتیجہ نکالا تھا کہ باوجود اس کے کہ اسلام اندلس سے خارج کر دیا گیا ہے لیکن اس کی تہذیب اور ثقافت آج بھی باقی ہے۔ ثقافت کے آثار دیکھنے ہوں تو ان علوم و فنون کو دیکھئے جو عربیت کی روح سے معمور ہیں، اسپین کی زبان میں عربی کے بے شمار الفاظ موجود ہیں جن کا تعلق ثقافت و تہذیب سے وابستہ ہے۔ (ص ۱۰۴) قحط عام الرمادہ اور علامہ صلاح الدین خلیل بن ایبک صفدی (م ۷۶۴ھ) کی "نکت الھمیان فی نکت العمیان" کا اردو میں مفصل تعارف "کورستان کی علمی سیر" پڑھنے کے قابل ہے۔ مغربی علوم کے اسلامی سرچشمے اور خلفاء اربعہ کا اہتمام حدیث وغیرہ مضامین میں بعض نئی معلومات نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ پروف ریڈنگ بڑی باریک بینی سے کی گئی ہے۔ مگر مصنّف کے نام کے آخر میں صفدی کے بجائے صفوی لکھ گیا ہے۔ بعض مقامات پر آیتیں غیر معرب بھی موجود ہیں۔

ان معمولی فروگذاشتوں سے اس مجموعہ کی افادیت و اہمیت پر چنداں فرق نہیں پڑتا۔ مواد کی پیشکش اور کتاب کی ترتیب و تدین میں مرتب کی خوش سلیقگی نمایاں ہے۔ (ک، ص اصلاحی)

ادبیات

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
گوشۂ مطالعات نعت، علی گڑھ
موبائل نمبر: ۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

جہاں زیر و زبر ، آباد یا برباد ہونا تھا
ہمیں ہر حال میں آقاؐ کا اسوہ یاد ہونا تھا

فضا بدلی گئی عالم کی ، رفتارِ زماں بدلی
انہیںؐ رونق فزاے محفل ایجاد ہونا تھا

عیاں ہونا تھا مقصد احترامِ آدمیت کا
غلاموں ، مفلسوں کو جبر سے آزاد ہونا تھا

زمانہ آنے والا تھا ضیاے عدل و نصفت کا
بہ ہر صورت ختامِ ظلمتِ بیداد ہونا تھا

بتائی آپؐ نے سب کو حقیقت کفر و ایماں کی
جو تھے اوہام کے قیدی انہیں آزاد ہونا تھا

بنایا ان کو بھی لطف و کرم کا آپؐ نے خوگر
وتیرہ جن کا اکثر قاتلِ اولاد ہونا تھا

یقیناً یہ کرشمہ ہے خدا کے علم و حکمت کا
اک امّی کو جہاں بھر کے لیے استاد ہونا تھا

بھلا ڈالا ہے اپنی غفلتوں سے ہم نے آقاؐ کا
سبق ، جو زندگی کے ہر قدم پر یاد ہونا تھا

دعا کرتے نہ گر آقاؐ، تو اے قومِ مسلماناں
ترا انجام بھی مثلِ ثمود و عاد ہونا تھا

عطا کی ہے مجھے رب نے محبت سرورِ دیں کی
زہے قسمت دل اُنؐ کی یاد سے آباد ہونا تھا

اگر آنکھوں کے مندتے ہی قیامت آگئی تو کیا
ظہورِ معنیِ لا یخلف المیعاد ہونا تھا

ملا اذنِ حضوری مالکِ کعبہ کی جانب سے
دلِ ناشاد کو اک دن مرے یوں شاد ہونا تھا

دوبارہ ہند میں آکر ہوا کیا فائدہ حاصل
رئیسِ کم نظر ، طیبہ میں ہی آباد ہونا تھا

غزل

وارث ریاضی
کاشانۂ ادب، سکٹا(دیوراج)پوسٹ بسوریا، وایا۔لوریا، مغربی چمپارن، بہار

بڑی سادگی میں گزری، مری زندگی الٰہی!
نہ مسرتوں کی خواہش ، نہ خیالِ مرغ و ماہی

یہ عجیب ماجرا ہے کہ سکونِ دل کی خاطر
میں جہاں جہاں بھی پہنچا، مچی تھی وہاں تباہی

مرے ضبطِ غم کے خط نے، انہیں دیر تک رلایا
بڑا کام کرگئی ہے، مرے قلب کی سیاہی

کسے رازِ غم بتاؤں؟ کسے حالِ دل سناؤں؟
نہ اجازتِ گزارش، نہ مجالِ داد خواہی

بڑی بے کلی میں گزریں مری زندگی کی گھڑیاں
نہ شبِ چمن میسر، نہ نسیم صبح گاہی

میں وہ بدنصیبِ دوراں، جسے کچھ نہیں ملا ہے
نہ کمالِ علم و دانش، نہ مزاج خانقاہی

نہ سنوں گا میں کسی کی، کوئی کیا بگاڑلے گا؟
کہ جہاں میں اب ہے جاری یہی رسم کجکلاہی

یہ غضب کے رہ نما ہیں، انہیں کچھ خبر نہیں ہے
نہ تدبرِ سیاست، نہ شعور پادشاہی

میں خوشی سے چل پڑا ہوں رہِ پُرخطر پہ وارثؔ
مرے دوستو! نہ روکو! میں رہِ وفا کا راہی

معارف کی ڈاک

"فاحش غلطیاں"

معارف کے تازہ شمارے (فروری ۲۰۲۵) میں اپنا خط دیکھ لیا ہے، میں نے اپنے مسودے میں فاحش غلطیاں لکھا تھا، آپ کے ایڈیٹر نے اسے فحش غلطیاں بنا دیا ہے۔ خدارا اسے فائل میں درست (فاحش غلطیاں) ہی لکھیں اور چھاپیں۔ مدیر صاحب کو فاحش اور فحش میں امتیاز معلوم نہیں ہے غالباً۔

عارف نوشاہی، لاہور

naushahiarif@gmail.com

معارف: شکریہ۔ مدیر پر تقصیر تو فی الحال میں ہی ہوں لیکن یہ غالباً پروف ریڈر حضرات کا کام ہے جو مجھے درست لگتا ہے۔ اردو میں "فحش غلطیاں"، "فحش نگار" وغیرہ بولتے اور لکھتے ہیں۔ ممکن ہے فارسی میں "فاحش" رائج ہو۔ عربی میں بھی "فاحش" ہی لکھا جاتا ہے جیسے "اخطاء فاحشۃ" (ظفر الاسلام خان)۔[۱]

اسلامی قانون فوجداری

ماشاءاللہ ! اس سال کے پہلے ہی مہینے جنوری میں شائع ہونے والے مجلہ معارف میں اسلامی قانون فوجداری کے تعلق سے تفصیلی تعارف پڑھا، بہت خوشی ہوئی۔ بندہ اس طرح کے موضوعات سے خاص دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ عالمیت کر کے بندہ وکالت کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ملک گیر سطح پر علماء اور مفکرین حضرات قانونی پیشہ میں علماء کی نمائندگی کے لئے بڑے پیمانہ پر کوشاں ہیں اور الحمدللہ تقریباً ۱۰۰ سے زائد علماء ملک کے مختلف خطوں سے اس پیشہ میں بھی قابل تحسین خدمات دے رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اس طرح کی کتابوں کا تعارف سامنے آنا بڑی قابل ستائش بات ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ کو جاری وساری رکھا جائے۔

پٹیل سلمان، گجرات

۷۷۷۷۹۱۷۳۴۷

---

[۱] اردو کے بڑے ادیب و نقاد پروفیسر خالد محمود صاحب سے اس بابت رائے معلوم کی گئی تو انھوں نے کہا کہ ہم نے تو کبھی "فاحش غلطیاں" نہ سنا، نہ لکھا ہوا دیکھا (مدیر)۔

رسید کتب موصولہ

حکیم سید ظل الرحمٰن، ابن سینا اکاڈمی میں غالب مجلات: ابن سینا اکادمی، دودھ پور، علی گڑھ، صفحات: ۳۷۹، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۷۵ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۵۸۲۵۹۷۴۰

ڈاکٹر هیفا شاکری، اسهام الهنود فی اعداد المعاجم العربية وتحقيقها (عربی) جلد اول و دوم: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات بالترتیب: ۹۵۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۸۱۱۷۹۴۸۲۲

محمد سلمان بجنوری ندوی، تذکرہ ایک مردِ مومن کا: مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صفحات: ۱۴۴، سالِ اشاعت، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۴۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۰۹۰۲۶۳۴۶۸

اسد مرزا، ڈی مسٹی فائنگ مدرسہ اینڈ دیوبندی اسلام (انگریزی): ویتاستا پبلیشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، انصاری روڈ، دریاگنج، نئی دہلی، صفحات: ۲۷۱، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۹۵ روپے، ای میل: info@vitastapublishing.com

مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری، صحیح مسلم کی خصوصیات مع بعض احادیث کی تشریح و تخریج: جمعیۃ المعارف الاسلامیۃ، ٹیگور مارگ نزد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صفحات: ۲۱۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۸۴۷۷۸۸۰۰

ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، گیان چند جین کے خطوط مشاہیر ادب کے نام (جلد اول): مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، اے ایم یو، علی گڑھ، صفحات: ۶۳۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۷۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲

مولانا محمد نصر اللہ ندوی، مساجد میں خواتین کی آمد شرعی احکام و مسائل: مکتبہ احسان، نزد شہاب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ، صفحات: ۳۶۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: درج نہیں، ای میل: shariahacademynadwa@gmail.com

فیصل احمد بھٹکلی ندوی، مفتی عبداللطیف رحمانی۔ احوال و آثار: مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ، صفحات: ۶۳۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۷۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۱۹۸۶۲۱۶۷۱

ڈاکٹر محمد وقار الدین لطیفی ندوی، ملتِ اسلامیہ کے لیے راہِ عمل: مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، نئی دہلی، صفحات: ۲۸۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: درج نہیں۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، ہدایت الٰہی نصیب ہونے کے فیوض و نقوش: اسلام منزل، اسٹریٹ نمبر۔۸، اقرا کالونی، علی گڑھ، صفحات: ۸۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۰۵۸۲۸۱۴۹۴

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت وشیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

MAR 2025 Vol- 212(03) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org